قاعدے: ماضی مطلق کے آخر میں 'تھا' زیادہ کرتے ہیں جیسے آیا سے آیا تھا، لایا سے لایا تھا۔

(د) ماضی استمراری یا ناتمام (Past Imperfect Tense) : وہ فعل ہے جس سے گزرے ہوئے زمانہ میں کسی کام کا بار بار ہونا یا پورا نہ ہونا پایا جائے جیسے دوڑتا تھا، جاتا تھا۔

نوٹ : کام کا لگاتار ہونا پایا جائے تو استمراری ہے اور کام پورا نہ ہونا پایا جائے تو ناتمام ہے دونوں کے صیغے ایک ہی ہوتے ہیں۔

قاعدہ : علامت مصدر ''نا'' گرا کے ''تا تھا'' زیادہ کرنے سے بنتی ہے۔ جیسے لکھنا ← لکھتا تھا، پڑھنا ← پڑھتا تھا۔

(ھ) ماضی شکی یا احتمالی (Past Dubious Tense)

وہ فعل ہے جس سے گزرے ہوئے زمانے میں کام کے ہونے یا نہ ہونے میں شک وشبہ پایا جائے۔ جیسے گیا ہوگا، بھاگا ہوگا وغیرہ۔

قاعدہ : ماضی مطلق کے آخر میں صیغوں کی رعایت سے ''ہوگا'' لگا دیتے ہیں۔

(و) ماضی شرطی یا تمنائی (Past Optative Tense) وہ ہے جس سے گزرے ہوئے زمانے میں شرط یا تمنا پائی جائے اگر شرط پائی جائے تو شرطی تمنا پائی جائے تو تمنائی جیسے اگر پاتا، اگر کھاتا، کاش دوڑتا۔

قاعدہ: ۱) علامت مصدر ''نا'' دور کر کے ''تا'' زیادہ کرتے ہیں۔ جیسے کھانا سے کھاتا، جانے سے جاتا۔

۲) ماضی مطلق کے آخر میں ''ہوتا'' لگا دیتے ہیں۔ جیسے کھایا سے کھایا ہوتا، پیا سے پیا ہوتا۔

۳) ماضی شکی سے گا، گی، گے۔ الگ کر دیتے ہیں۔ مثلاً آیا ہوگا سے آیا ہو، گیا ہوگا سے گیا ہو۔

۲) فعل حال (Verb Present): فعل حال: وہ فعل ہے جس سے موجودہ زمانہ سمجھا جائے۔

قاعدہ(۱) علامت مصدر ''نا'' دور کر کے ''تا ہے'' زیادہ کرتے ہیں۔ جیسے آنا سے آتا ہے، کھلنا سے کھیلتا ہے۔

(۲) علامت مصدر ''نا'' دور کر کے ''رہا ہے'' بڑھاتے ہیں۔ جیسے کھیلا سے کھیل رہا ہے۔

۳) فعل مستقبل (Verb Future) : فعل مستقبل : وہ فعل ہے جس سے آنے والا زمانہ سمجھا جائے جیسے جائے گا۔ لکھے گا۔

قاعدہ : علامت مصدر دور کر کے جو لفظ باقی رہے اس کے آخر میں بھول اور ''گا'' لگا دیتے ہیں۔

جیسے جانا جا + ے +گا = جائے گا لکھنا لکھ + ے+گا= لکھے گا

۴) فعل مضارع (Aorist Term)

فعل مضارع : وہ فعل ہے جس میں حال اور مستقبل دونوں زمانے پائے جائیں جیسے عارف آئے۔تو کام میں میرا ہاتھ بٹائے ،فرید ورزش کرے،تو تندرست رہے۔

قاعدہ : علامت مصدر دور کرنے کے بعد جو باقی رہے اس کے آخر میں (ے) یا (دے) زیادہ کرتے ہیں۔جیسے

کرنا کر+ ے = کرے یا کردے بٹانا بٹا + ے = بٹائے یا بٹادے

نوٹ : اوپر بیان کئے ہوئے چار فعلوں کے بنانے کا جو قاعدہ ہم نے بتایا ہے وہ صرف واحد غائب کے صیغے کا ہے بغیر پانچ صیغے ضمیروں کے لانے اور کچھ تبدیلیاں کرنے سے بنائے جاتے ہیں۔جیسا کہ آئندہ نقشہ گردان سے ظاہر ہوگا۔

۵) فعل امر (Imperative Verb)

فعل امر: وہ فعل ہے۔جس سے کسی کام کے کرنے کا حکم پایا جائے یا فرمائش پائی جائے۔امر کے صرف دو ہی صیغے ہیں واحد حاضر اور جمع حاضر

قاعدہ : علامت مصدر دور کرنے کے بعد جو باقی رہے وہی امر ہوتا ہے جیسے مرنا سے مر،کرنا سے کر، ڈرنا سے ڈر۔ امر کے بعض صیغے تنبیہ کے موقع پر استعمال ہوتے ہیں۔مثلاً دیکھو، سنو

۶) فعل نہی (Negative Imperative): وہ فعل ہے جس میں کسی کام کے کرنے سے روکنے کا حکم پایا جائے جیسے نہ جاؤ، نہ کھاؤ۔

قاعدہ: فعل امر سے پہلے ''نہ'' لگانے سے فعل نہی بن جاتا ہے۔جیسے 'کبھی نہیں'' فعل امر کے آخر میں آ کر نہی کا کام دیتا ہے۔جیسے ''پوچھو نہیں'' مصدر سے پہلے ''نہ'' آتا ہے تو بھی فعل نہی کا کام دیتا ہے۔جیسے نہ بتانا۔

ب فعل معروف (Active Voice)

ا۔فعل معروف وہ فعل ہے جس کا فاعل معلوم ہو جیسے رام نے بلایا۔

۲۔فعل مجہول (Passive Voice) وہ فعل ہے جس کا فاعل معلوم نہ ہو جیسے احمد بلایا گیا، فعل مجہول ہمیشہ متعدی ہوتا ہے۔

فعل مجہول بنانے کا قاعدہ: جس فعل کا مجہول بنانا منظور ہو ''جانا'' سے وہی فعل پہلے بنالو اور اس کے پہلے

جس فعل کا مجہول بنانا ہو اس کا ماضی مطلق بنا کر لگا دو جیسا کہ گردانوں سے ظاہر ہوگا۔ جیسے مارا گیا۔ مارے گئے۔

نوٹ: قاعدہ فعل مجہول مذکر بنانے کا ہے۔ مونث کی تبدیلیاں گردانوں سے معلوم کرو۔

فعل معروف و مجہول کا فرق: فعل معروف میں فاعل معلوم ہوتا ہے اور فعل مجہول میں فاعل معلوم نہیں ہوتا۔ اردو میں مجہول کی بھی دو قسمیں ہیں۔ (۱) لفظی (۲) معنوی

لفظی : وہ ہے جس میں علامت مجہول ظاہر ہو۔ جیسے مارا گیا۔

معنوی : وہ ہے جس میں علامت مجہول ظاہر نہ ہو۔ جیسے لٹنا، بچنا وغیرہ۔

امدادی افعال : افعال امدادی وہ ہیں۔ جو خود معنی نہیں دیتے بلکہ اصل فعل کے معنوں میں زیادہ تبدیلی پیدا کرتے ہیں۔ مثلاً وہ اپنا کام کر چکا۔ میں نے ہرن کو پکڑ لیا۔ عظیم ٹھوکر لگتے ہی گر پڑا۔ جو افعال امداد کے لئے لائے جاتے ہیں۔ وہ حسب ذیل مصادر سے نکلتے ہیں، ہونا، دینا، لینا، سکنا، لانا، رہنا، رکھنا، چکنا، چاہنا، ڈالنا، پڑنا۔

نقشہ گردان

(۱) گردان ماضی مطلق (معروف)

صیغے	واحد غائب	جمع غائب	واحد حاضر	جمع حاضر	واحد متکلم	جمع متکلم
مذکر	وہ آیا	وہ آئے	تو آیا	تم آئے	میں آیا	ہم آئے
مونث	وہ آئی	وہ آئیں	تو آئی	تم آئیں	میں آئی	ہم آئے [1]

(۲) گردان ماضی قریب (معروف)

مذکر	وہ آیا ہے	وہ آئے ہیں	تو آیا ہے	تم آئے ہو	میں آیا ہوں	ہم آئے ہیں
مونث	وہ آئی ہے	وہ آئی ہیں	تو آئی ہے	تم آئی ہو	میں آئی ہوں	ہم آئے ہیں

۳) گردان ماضی بعید (معروف)

صیغے	واحد غائب	جمع غائب	واحد حاضر	جمع حاضر	واحد متکلم	جمع متکلم
مذکر	وہ آیا تھا	وہ آئے تھے	تو آیا تھا	تم آئے تھے	میں آیا تھا	ہم آئے تھے
مونث	وہ آئی تھی	وہ آئیں تھیں	تو آئی تھی	تم آئیں تھیں	میں آئی تھی	ہم آئے تھے

۱ جمع متکلم کا صیغہ مذکر و مونث دونوں کے لئے یکساں ہوتا ہے۔

۴) گردان ماضی استمراری یا ناتمام (معروف)

مذکر	وہ آتا تھا	وہ آتے تھے	تو آتا تھا	تم آتے تھے	میں آتا تھا	ہم آتے تھے
مونث	وہ آتی تھی	وہ آتی تھیں	تو آتی تھی	تم آتی تھیں	میں آتی تھی	ہم آتے تھے

۵) گردان ماضی شکی یا احتمالی (معروف)

مذکر	وہ آیا ہوگا	وہ آئے ہونگے	تو آیا ہوگا	تم آئے ہوگے	میں آیا ہونگا	ہم آئے ہونگے
مونث	وہ آئی ہوگی	وہ آئیں ہونگی	تو آئی ہوگی	تم آئی ہوگی	میں آئی ہونگی	ہم آئے ہونگے

۶) گردان ماضی شرطی یا تمنائی (معروف)

مذکر	وہ آتا	وہ آتے	تو آتا	تم آتے	میں آتا	ہم آتے
مونث	وہ آتی	وہ آتیں	تو آتی	تم آتیں	میں آتی	ہم آتے

۷) گردان فعل مضارع (معروف)

مذکر	وہ آئے	وہ آئیں	تو آئے	تم آؤ	میں آؤں	ہم آئیں
مونث	وہ آئے	وہ آئیں	تو آئے	تم آؤ	میں آؤں	ہم آئیں

۸) گردان فعل حال (معروف)

مذکر	وہ آتا ہے	وہ آتے ہیں	تو آتا ہے	تم آتے ہو	میں آتا ہوں	ہم آتے ہیں
مونث	وہ آتی ہے	وہ آتی ہیں	تو آتی ہے	تم آتی ہو	میں آتی ہوں	ہم آتے ہیں

(۹) گردان فعل مستقبل (معروف)

صیغے	واحد غائب	جمع غائب	واحد حاضر	جمع حاضر	واحد متکلم	جمع متکلم
مذکر	وہ آئے گا	وہ آئیں گے	تو آئے گا	تم آؤ گے	میں آؤں گا	ہم آئیں گے
مونث	وہ آئیگی	وہ آئیں گی	تو آئیگی	تم آؤ گی	میں آؤں گی	ہم آئیں گے

۱۰) گردان فعل امر (معروف)

مذکر	×	×	تو آ	تم آ ؤ	×	×
مونث	×	×	تو آ	تم آ ؤ	×	×

۱۱) گردان فعل نہی (معروف)

مذکر	×	×	تو نہ آ	تم نہ آ ؤ	×	×
مونث	×	×	تو نہ آ	تم نہ آ ؤ	×	×

فعل مجہول کی گردانیں

صیغے	ماضی مطلق مجہول	ماضی قریب مجہول	ماضی بعید مجہول	ماضی استمراری مجہول	ماضی شکی مجہول	ماضی شرطی مجہول
واحد غائب	وہ لایا گیا	وہ لایا گیا ہے	وہ لایا گیا تھا	وہ لایا جاتا تھا	وہ لایا جاتا ہوگا	وہ لایا جاتا
جمع غائب	وہ لائے گئے	وہ لائے گئے ہیں	وہ لائے گئے تھے	وہ لائے جاتے تھے	وہ لائے جاتے ہونگے	وہ لائے جاتے
واحد حاضر	تو لایا گیا	تو لایا گیا ہے	تو لایا گیا تھا	تو لایا جاتا تھا	تو لایا جاتا ہوگا	تو لایا جاتا
جمع حاضر	تم لائے گئے	تم لائے گئے ہو	تم لائے گئے تھے	تم لائے جاتے تھے	تم لائے جاتے ہونگے	تم لائے جاتے
واحد متکلم	میں لایا گیا	میں لایا گیا ہوں	میں لایا گیا تھا	میں لایا جاتا تھا	میں لایا جاتا ہونگا	میں لایا جاتا
جمع متکلم	ہم لائے گئے	ہم لائے گئے ہیں	ہم لائے گئے تھے	ہم لائے جاتے تھے	ہم لائے جاتے ہونگے	ہم لائے جاتے

مثبت و منفی: مثبت (Affirmative) وہ فعل ہے جس سے کام کا ہونا پایا جائے۔ جیسے میں وہاں گیا

منفی (Negative) وہ فعل ہے۔ جس سے کام کا نہ ہونا پایا جائے جیسے نہ گیا، نہ کیا۔

نوٹ:۔ مضارع اور ماضی شرطی یا تمنائی پر ''نہ'' لگاتے ہیں۔ مثلاً وہ نہ لاتا، وہ نہ لایا ہو، لفظ ہیں۔ استعمال نہیں کرتے، منفی کے جن صیغوں میں نہیں آتا ہے ان میں ہے اور ہیں استعمال نہیں کرتے۔

نہی اور نفی کا فرق (Prohibitives Negative) ''نہی'' میں حکم ہوتا ہے اور نفی میں حکم نہیں ہوتا۔

(د) علامت فاعل 'نے' کے استعمال کے قاعدے: فعل متعدی میں ماضی مطلق، ماضی قریب، ماضی بعید

اور ماضی شکی کے فاعل کی علامت لفظ 'نے' ہے بشرطیکہ متعدی مذکور فعل لازم سے مرکب نہ ہو جیسے میں نے کھایا ہے اوراس نے مارا تھا۔مگر بولنا، لانا اور بھولنا خارج ہیں۔یعنی باوجود متعدی ہونے کے ان میں علامت فاعل نہیں آتی جیسے وہ لایا اور تو بھولا، اسی طرح اگر کوئی متعدی فعل لازم سے مرکب ہو جیسے لے جانا اور دے بیٹھنا وغیرہ تب بھی علامت فاعل 'نے' نہ بولی جائیگی جیسے میں لے گیا۔وہ دے بیٹھا، تو کھا چکا، میں لے سکا وغیرہ۔

۱) جن فعلوں کے فاعلوں کے ساتھ حروف 'نے' مذکور نہیں ہوتا وہ تذکیر و تانیث اور واحد و جمع میں فاعل کے موافق بولے جاتے ہیں۔خواہ وہ لازم ہو یا متعدی خواہ ان کے مفعولوں کے ساتھ علامت مفعول ہو یا نہ ہو۔جیسے زید آیا، انیس گئی، ظفر اللہ لکھتا ہے، عارفہ پڑھتی ہے، رحمت اللہ خط لکھتا ہے، حسینہ خط پڑھتی ہے، لڑکے آئے، لڑکیاں آئیں،لڑکے کتابیں پڑھتے ہیں۔

۲) جن فعلوں کے فاعل کے ساتھ لفظ ''نے'' علامت فاعل تو ہو مگر علامت مفعول مطلقا نہ ہو تو وہ فعل مفعول کے موافق ہونگے خواہ فاعل مذکر ہو یا مونث واحد یا جمع مثلاً یوسف ''نے'' تختی لکھی۔فریدہ نے پانی پیا، عورتوں نے شربت کے پیالے پیئے۔

۳) اگر فاعل اور مفعول دونوں کی علامتیں مذکور ہوں تو فعل ہر حال میں واحد ہی۔مستعمل ہوگا خواہ فاعل اور مفعول مذکر ہوں یا مونث ۔ واحد ہوں یا جمع مثلاً سعید نے کتاب کو پڑھا۔ فاطمہ نے کتاب کو پڑھا۔ استادوں نے اپنے شاگردوں کو بلوایا۔لڑکیوں نے اپنی کتابوں کو پڑھ لیا۔

۴) جب مفعول کسی فعل کے جملے میں واقع ہو تو بھی فعل واحد مذکر ہوگا۔جیسے لڑکی نے کہا کہ میں کتاب پڑھتی ہوں، لڑکوں نے پوچھا تم کونسی کتاب پڑھتی ہو۔

۵) جب کئی اسم مذکر و مؤنث ایک فاعل کے تابع ہوں تو فعل کو آخر اسم کے موافق لائیں گے۔جیسے مرد، عورت، لڑکے، لڑکی آئی۔

(ھ) علامت مفعول ''کو'' کے استعمال کے قاعدے:

۱۔جب فعل کا مفعول ذی عقل ہو تو مفعول کے ساتھ ''کو'' آتا ہے۔مثلاً کلیم نے رحیم کو مارا، میں نے ابراہیم کو دیکھا۔

۲۔اگر مفعول غیر ذی عقل یا بے جان اشیاء میں سے ہے تو اس کے ساتھ 'کو' علامت،مفعول نہیں آتا جیسے

میں نے پانی پیا میں نے سانپ مارا

فاعل مفعول فعل فاعل مفعول فعل

بے جان غیر ذی عقل

۳۔ جب مفعول کے متعلق کوئی تخصیص اشارے یا اضافت وغیرہ سے پیدا کریں تو ''کو'' لانا ضروری ہے۔ جیسے میں نے جانور دیکھا۔ میں نے اس جانور کو دیکھا دوسرے جملے میں تخصیص اشارے (اس) سے پیدا کی گئی ہے۔

۴) محاورات میں جہاں مفعول مصدر کے ساتھ آتا ہے ''کو'' استعمال نہیں ہوتا۔ جیسے اس نے میری تباہی پر کمر باندھ رکھی ہے۔ (کمر باندھنا محاورہ ہے) اسی طرح بے جان اشیاء اور کیفیات قلبی کے ساتھ بھی ''کو'' استعمال نہیں ہوتا۔ مثلاً میں نے خط لکھا، غم نہ کرو۔

۵) جب عمومیت ہوتی ہے تو ''کو'' نہیں آتا لیکن جب خصوصیت کا اظہار کیا جاتا ہے۔ یا توجہ دلانی مقصود ہو تو ''کو'' بولتے ہیں۔

خصوصیت عمومیت

میرے پرچے کو دیکھو میں نے سب مدرسے دیکھے

۶) جہاں دو مفعول ہوں ایک قریب اور دوسرا بعید تو ایسی صورت میں مفعول قریب کے ساتھ ''کو'' نہیں لاتے، بعید کے ساتھ لاتے ہیں۔ جیسے میں نے تمہارا قلم حمید کو دے دیا۔

۷) جہاں دو مفعول ہوں اور ان میں سے ایک شخص ہو اور دوسرا شئی تو مفعول شخصی کے ساتھ ہمیشہ ''کو'' آتا ہے جیسے میں نے عادل کو خط دیا

مفعول شخصی مفعول شئی

فعل لازم و فعل متعدی

۱) فعل لازم (Intransitive Verb) : جس فعل کے وقوع میں آنے کے لئے کرنے والے کے سوا کسی دوسرے شخص یا چیز کا ہونا ضروری نہ ہو۔ اسے فعل لازم کہتے ہیں۔ جیسے بیٹھا، چلا، اٹھا، سویا وغیرہ

۲) فعل متعدی (Transitive Verb): جس فعل کے وقوع میں آنے کے لئے کرنے والے کے سوا کسی دوسرے شخص یا چیز کا ہونا ضروری ہو اسے فعل متعدی کہتے ہیں۔ جیسے پڑھایا۔ بھگایا وغیرہ

شناخت : ماضی مطلق (متعدی) کے فاعل کے بعد ''نے'' آتا ہے جیسے ابرار نے سہیل کو مارا، مگر لانا، لے جانا، بولنا، پر یہ قاعدہ عائدہ نہیں ہوتا۔ پکارنا، سیکھنا اور پڑھنا کے فاعل کے ساتھ ''نے'' آتا بھی ہے اور نہیں بھی آتا، فعل لازم کے فاعل کے ساتھ ''نے'' کبھی نہیں آتا۔

بعض مصدر لازم بھی ہوتے ہیں اور متعدی بھی۔ جیسے شرمانا۔ بعض مصدر لازم ہیں مگر کبھی کبھی ان کا مفعول بھی آجاتا ہے۔ جیسے آنا، فعل متعدی کا ایک مفعول بھی ہوتا ہے اور کئی بھی۔

لازم ومتعدی کی شناخت: اگر کسی فعل کے متعلق یہ معلوم کرنا ہو کہ یہ لازم ہے یا متعدی تو اس فعل کی ماضی بناؤ اور اس سے پہلے کوئی فاعل لگاؤ۔ اگر فاعل کے بعد ''نے'' علامت فاعل نکلے تب تو سمجھ کہ وہ متعدی ہے جیسے سونا مصدر کی ماضی ہے۔ ''سویا'' بس جب اس کے پہلے محمود۔ فاعل لگا کر کہیں گے کہ محمود سویا تو فعل لازم ہوگا۔ کیونکہ فاعل کے بعد علامت فاعل نہیں آتی۔ لیکن جب دیکھنا۔ مصدر سے دیکھا، ماضی بنا کر اس کے پہلے فاعل لگائیں گے تو کہیں گے۔

عظیم نے تماشاہ دیکھا۔ بس یہ متعدی ہوگا۔ مگر بعض اس قاعدے سے مستثنیٰ ہیں جیسے مصدر 'لانا' اور 'بولنا' وغیرہ

لازم اور متعدی کا فرق: فعل لازم صرف فاعل کو چاہتا ہے اور فعل، فاعل اور مفعول کو چاہتا ہے جیسے لکھنا، پڑھنا، کھانا فعل متعدی ہیں۔ اور آنا، جانا لازم۔

مصدر متعدی کی قسمیں:

۱) جو مصدر، متعدی ہی بنایا گیا ہو۔ اس کو متعدی بہ فقہ کہتے ہیں۔ جیسے لکھنا، پڑھنا

۲) جو لازم سے متعدی بنایا گیا ہو اس کو متعدی بلا واسطہ کہتے ہیں۔ جیسے جلنا سے جلانا، ڈرنا سے ڈرانا۔

۳) جو متعدی سے متعدی بنالیا ہو۔ دینا سے دلانا، کھانا سے کھلانا وغیرہ۔

حرف کی تعریف: وہ کلمہ ہے جو بغیر دوسرے لفظ کے ملے اپنے معنی نہ دے۔

حروف کی قسمیں: (۱) حروف جار (Preposition) : وہ اسم ہے جو کسی اسم کا تعلق فعل سے پیدا کرے۔

مجرور: وہ اسم ہے جس کے آخر یا اول میں کوئی حرف جر آئے حرف جار: میں، سے، کو، تک پر، کا، کے، کی

فائدہ: اوپر، نیچے، آگے، پیچھے، سامنے، ساتھ، سمیت، لئے، واسطے، درمیان، بیچ، اندر، باہر، بغیر، سوا، طرح، مانند، علاوہ، طرف پاس، نزدیک، خاطر، مارے، بھی حروف جار میں شمار کئے جاتے ہیں لیکن

اصل میں یہ اسم ہیں اور اضافت کے بغیر نہیں آتے جیسے کوٹھے کے اوپر۔ پہاڑی کے نیچے، اس کی طرح، ان کے علاوہ۔

۲) حروف ندا (Interjection) : حروف ندا۔ وہ حروف ہیں جن کے ذریعہ سے کسی کو پکارا جائے۔ منادیٰ (Nominative of Address or Vocative) وہ جس کو پکارا جائے۔

فائدہ : جن اسموں کے آخر میں الفؔ یا ہؔ ہو۔ حرف ندا سے وہ الف یا ہ میں بدل جاتا ہے۔ جیسے اے لڑکے۔ اے بندے۔

۳) **حروف ندبہ** : وہ حروف جو مصیبت اور رنج وافسوس ظاہر کرنے کے لئے بولے جاتے ہیں۔ مثلاً افسوس جوانی غفلت میں گزری، وائے برحال، ماغریباں ع ہے ہے! مجھے خار دے گیا کون

مندرجہ بالا جملوں اور مصرعہ میں ''افسوس'' ہے ہے، ''وائے'' ایسے حرف ہیں جن کے ذریعہ سے کسی پر رویا جاتا ہے۔

مندوب : وہ جن کا نام لے کر افسوس کیا جاتا ہے۔

۴) حروف شرط وجزاء (Conditional)

حروف شرط: وہ ہے جو کسی شرط کو ظاہر کرنے کے لئے جملے سے پہلے آتا ہے وہ یہ ہیں۔ جو، جب، اگر، چونکہ، مثلاً اگر فضل محنت کرتا تو اول نمبر میں کامیاب ہوتا۔ جو محنت کرتا ہے وہ پھل پاتا ہے۔ چونکہ کریم ہمیشہ کھیلتا تھا اس لئے امتحان میں ناکام ہوا۔ ع جب میکدہ چھٹا تو اب کیا جگہ کی قید مسجد ہو مدرسہ ہو کوئی خانقاہ ہو

فائدہ : حرف شرط کے بعد ہمیشہ دو جملے آتے ہیں۔ پہلے کو شرط کہتے ہیں۔ دوسرے کو جزاء

۵) حروف استثنا (Exception)

حروف استثنا : وہ حروف ہیں جو کسی چیز یا شخص کو اور چیزوں یا شخصوں سے الگ کرلیں وہ یہ ہیں۔ جز، بجز، سوا، اب، اکثر مفرد اسموں کے درمیان آتے ہیں۔ مگر، پر، لیکن، الاّ، جملوں کے درمیان آتے ہیں۔

۶) حروف تردید (Atternative)

حروف تردید: وہ حروف ہیں جو رد کرنے کے موقع پر بولے جاتے ہیں۔

۷) حروف نفرین (Hatred)

حروف نفرین : وہ جو نفرت ظاہر کرنے کے لئے آئیں۔ حروف نفرین یہ ہیں۔ چھی، تف، ہشت، لاحول، ہوں

نہیں، توبہ، اخ تھو، وغیرہ۔

۸) حروف تحسین (Praise)

حروف تحسین : وہ ہیں جن کے ذریعہ سے تعریف کی جائے مثلاً شاباش، واہ واہ، مرحبا وغیرہ۔

۹) حروف تشبیہ (Simile)

حروف تشبیہ: وہ حروف ہیں جن سے ظاہر ہو کہ ایک چیز کو دوسری چیز سے مانند کرلیا گیا ہے۔ مثلاً جیسے، طرح، گویا، مانند، مثل، سا، جوں وغیرہ۔

۱۰) حروف تاکید: (Emphatic)

حروف تاکید : وہ حروف ہیں جس سے کسی اسم کی تاکید کی جائے مثلاً ہرگز۔ سب، کل، تمام وغیرہ

۱۱) حروف عطف (Conjunction)

حروف عطف وہ حرف ہیں جو دو لفظوں یا جملوں کو آپس میں ملاتے ہیں۔ ''واؤ'' فارسی کا حروف عطف ہے۔ عربی اور فارسی لفظوں کے درمیان ملانے کے کام میں آتا ہے ''اور'' کو صرف دو چیزوں کے ملانے کے لئے بولتے ہیں۔ ''پھر'' میں ترتیب بھی پائی جاتی ہے۔

فائدہ: حرف عطف سے پہلے جو کلمہ یا جملہ آتا ہے۔ اس کو ''معطوف علیہ'' اور جو بعد میں آتا ہے اس کو ''معطوف'' کہتے ہیں۔

۱۲) حروف علّت (Gausative)

حروف علّت: وہ حروف ہیں جس سے کسی کام کا سبب ظاہر ہو۔ مثلاً کیونکہ، اس لئے، یوں، چونکہ، تار، تاکہ۔ جملوں کے پہے سبب کے لئے آتے ہیں، سبب کو علّت کہتے ہیں۔ اس لئے ان حروف کا نام ''حروف علّت'' ہے۔

۱۳) حروف ظرف (Adverb of Quantity):

حروف ظرف وہ حروف ہیں جو ظرفیت کے موقع پر بولے جائیں

فائدہ: اب تک، جب، کبھی، ظرف زمان کے لئے آتے ہیں اور باقی ظرف مکان کے لئے۔

حروف مقدار (Adverbs):

حروف مقدار: وہ حروف ہیں جو مقدار اور اندازہ کے مقام پر بولے جاتے ہیں۔مثلاً اِتنا، اُتنا، جتنا، کتنا، جمع میں اتنے،اُتنے جتنے، کتنے، مونث میں اتنی، جتنی، کتنی بولے جاتے ہیں۔

۱۵۔ حروف استدراک (Corrections): حروف استدراک وہ حروف ہیں جو ایسے جملوں کے درمیان میں آئیں کہ اس میں سے دوسرا جملہ پہلے جملے کے شک کو دفع کرے۔مثلاً لیکن، مگر، پر،

الاّ ؎ جانتا ہوں ثواب طاعت وزہد پر طبیعت اِدھر نہیں آتی

پہلے مصرعہ کے سننے سے یہ شک ہوتا ہے۔کہ شاعر بھی زہد وطاعت کا پابند ہوگا۔پر طبعیت ادھر نہیں آتی۔کہنے سے یہ شک دفع ہوا۔

فائدہ: حرف استدراک سے پہلے جملے کو ''مستدرک منہ'' اور بعد کے جملے کو مستدرک کہتے ہیں۔

علم نحو (Syntax) :

نحو: وہ علم ہے جس سے معلوم ہو کہ کلام میں کلموں کو باہم کس طرح ملاتے ہیں۔ان کا آپس میں کیا لگاؤ ہوتا ہے۔کس کس کلمہ کو کہاں کہاں رکھنا چاہئے۔کون سا کلمہ کس کلمے کے مطابق ہونا چاہئے غرض اس علم سے فائدہ یہ ہے کہ انساں صحیح کلام بولے اور غلطیوں سے بچے۔

جملہ (Sentence):

جملہ:لفظوں کے اس مجموعے کو کہتے ہیں۔جس سے پوری بات سمجھی جائے۔جیسے لڑکا آیا،رشید جائے گا،بستر صاف ہے۔

جملے کے اجزاء : (۱)سلیم آیا (۲)آسمان نیلا ہے(۳)کلکتہ دور ہے

اوپر کے جملوں میں سلیم کی نسبت کہا گیا کہ وہ ''آیا''، آسمان کی نسبت کہا گیا۔کہ ''نیلا'' ہے۔کلکتہ کی نسبت کہا گیا کہ ''وہ دور ہے'' اس سے معلوم ہوا کہ جملے کے دو جز ہوتے ہیں۔

۱۔ ایک وہ کہ جس کے بارے میں کچھ کہا جائے اسے مسندالیہ کہتے ہیں۔

۲۔ مسندالیہ کے بارے میں جو کچھ کہا جائے اسے مسند کہتے ہیں۔

اوپر کے جملوں میں سلیم، اور آسمان مسندالیہ ہیں۔آیا نیلا ہے۔دور ہے، مسند ہیں۔

(نوٹ) مسندالیہ کو مبتدا اور مسند کو خبر کہتے ہیں۔

جملے کی قسمیں: اس کی دو قسمیں ہیں۔(۱) مفرد جملہ (۲) مرکب جملہ

۱۔مفرد جملہ، وہ جملہ ہے جو ایک ہی مسند اور مسند الیہ سے بنا ہو جیسے کتاب رکھی۔ ہمارا دوست آتا ہے۔

۲۔مرکب جملہ: وہ جملہ ہے جو دو یا دو سے زیادہ مفرد جملوں کے ملنے سے بنا ہو جیسے اشرف آیا اور سبق شروع ہوا، ہم میسور گئے تھے، مگر تم وہاں موجود نہ تھے۔ مندرجہ بالا نمبر (۱) کے جملے ایک ہی فعل سے بنے ہیں۔ ان میں ایک ہی مسند الیہ اور ایک ہی مسند ہے۔ ایسے جملے مفرد جملے کہلاتے ہیں۔ (مفرد معنی اکیلا) نمبر (۲) کے جملے دو یا دو سے زیادہ مفرد جملوں کے ملنے سے بنے ہیں۔ ایسے جملے مرکب جملے کہلاتے ہیں۔

مفرد جملوں کی قسمیں: اس کی دو قسمیں ہیں۔(۱) جملہ فعلیہ (۲) جملہ اسمیہ

جملہ فعلیہ: وہ جملہ ہے جس میں فعل مسند اور اسم مسند الیہ ہوتا ہے۔ جیسے نوید آیا، اسلم نے سبق پڑھا۔ ان جملوں میں مسند فعل ہے۔

جملہ اسمیہ : وہ جملہ ہے جس کے دونوں جز اسم ہوں۔ جیسے راشدہ ہوشیار ہے، احمد بیمار ہے۔ ان جملوں میں مسند اسم ہے۔ اب تک دو طرح کے مفرد جملے بناوٹ کے اعتبار سے پڑھے ہیں۔

(۱) فعلیہ (۲) اسمیہ معنی کے اعتبار سے جملے کی دو قسموں کو بتایا جا رہا ہے۔

(۱) جملہ خبریہ (Indicative Mood) (۲) جملہ انشائیہ (Optative Mood)

جملہ خبریہ : وہ جملہ ہے جو کسی واقعہ یا حالت کی خبر دے اور وہ جملہ سچ یا جھوٹ ہو سکے۔ مثلاً بلّی چوہے کو کھاتی ہے۔ آسمان پیلا ہے۔

جملہ انشائیہ : وہ جملہ ہے جس میں سچ یا جھوٹ نہ ہو مثلاً کیا کل تم آؤ گے جب کبھی آؤ تو اپنے چھوٹے بھائی کو ساتھ لانا،

مرکب جملہ : وہ جملہ ہے جو دو یا دو سے زیادہ مفرد جملون کے آپس میں ملنے سے بنا ہو۔

مرکب جملوں کی قسمیں:

(۱) جملہ معطوفہ (Conjuctive) بادل گرجتے ہیں اور پانی برستا ہے۔ اوپر کا مرکب جملہ دو جملوں سے ملکر بنا ہے۔ جن کے درمیان (اور) حروف عطف ہے پہلا جملہ معطوف علیہ اور دوسرا جملہ معطوف ہے دنوں کے ملنے سے مرکب جملہ معطوفہ بنا ہے۔

جملہ معطوفہ : وہ مرکب جملہ ہے جو بذریعہ حرف عطف دو جملوں کے ملنے سے بنا ہو۔

(۲) جملہ معلّلہ (Causative) وہ مرکب جملہ ہے جو بذریعہ حرف علّت دو جملوں کے ملنے سے بنا ہو مثلاً کریم اب یہیں ٹھہرے گا کیونکہ اس نے یہاں پر ایک مکان خریدا ہے، اس مرکب جملے میں دو جملے حرف ''کیونکہ'' کے ذریعہ ملتے ہیں۔ ''کیونکہ'' حرف علت ہے۔ اس لئے یہ پورا جملہ معللّہ ہوا پہلے جملے کو معلول اور دوسرے کو علّت کہتے ہیں۔

(۳) جملہ شرطیہ (Conditional Clause) : وہ مرکب جملہ ہے جو حرف شرط و جزاء کے ذریعہ دو جملوں کے ملنے سے بنا ہو مثلاً اگر محنت کرو گے تو پھل پاؤ گے۔ یہ دو جملوں کے ملنے سے بنا ہے (۱) محنت کرو گے (۲) پھل پاؤ گے۔ ان دو جملوں کو اگر حرف شرط اور ''تو'' حرف جزا ملاتا ہے۔ پس یہ مرکب جملہ ''جملہ شرطیہ'' ہوا۔

(۴) جملہ قسمیہ (Asservative) یہ وہ مرکب جملہ ہے جو قسم کے ذریعہ دو جملہ کے ملنے سے بنا ہو۔ جیسے خدا کی ''قسم'' میں جھوٹ نہیں بولتا۔ جملہ قسمیہ کا ایک جز و قسم اور دوسرا جواب قسم کہلاتا ہے۔

(۵) جملۂ ندائیہ (Vocative) وہ مرکب جملہ ہے جو خدا کے ذریعہ دو جملوں کے ملنے سے بنا ہو۔ جیسے یا خدا میری خبر لے۔

(۶) جملہ استدراکیہ (Corrective) وہ مرکب جملہ ہے جو دو جملوں کے بذریعہ حرف استدراک ملنے سے بنا ہو جیسے میں ضرور آتا مگر بارش ہو رہی تھی۔ یہ مرکب جملہ دو جملوں سے ملکر بنا ہے۔ اس کے درمیان ''مگر'' حرف استدراک ہے، پہلا جملہ مستدرک منہ اور دوسرا جملہ مستدرک ہے۔

(۷) جملہ بیانیہ (Explanative) وہ مرکب جملہ ہے جو بذریعہ حرف بیان دو جملوں کے ملنے سے بنا ہو۔ جیسے بادشاہ نے کہا کہ فوج حاضر ہو، اس میں دوسرا جملہ پہلے کا تابع ہے اس مرکب جملے کے ہر دو حصے کے درمیان ''کہ'' حرف بیان موجود ہے۔ پس یہ جملہ بیانیہ جملہ ہے۔ اس کا پہلا حصّہ ''مبین'' اور دوسرا ''بیان'' ہے۔

(۸) جملہ موصولہ (Relative) یہ وہ مرکب جملہ ہے جو موصول اور صلہ سے مل کر بنا ہو۔ جیسے جو لڑکا محنت کرتا ہے وہ کامیاب ہوتا ہے۔ اس جملہ میں جو لڑکا محنت کرتا ہے۔ ''موصول'' اور وہ کامیاب ہوتا ہے ''صلہ'' کے ملنے سے بنا ہے یہ جملہ موصولہ ہے۔

IV - تخلیقی صلاحیتیں Creative Competencies

زبان کی تدریس کا مقصد طالب علم کو اس کی مادری زبان میں بہتر طور پر اظہار کرنے کے قابل بنانا اور اپنی زبان میں تخلیقی اظہار کی صلاحیت پیدا کرنا ہے۔ ہمیں نثر پڑھاتے وقت نثر میں تخلیقی صلاحیت پیدا کرنے کی کوشش کرنی ہوگی جبکہ شاعری پڑھاتے وقت ہماری یہ کوشش ہونی چاہئے کہ طالب علم میں شعر فہمی کی صلاحیت پیدا ہو اور اس میں مختلف اصناف شاعری کے فرق کو جانتے ہوئے ان کی شناخت کرنے کی اہلیت اجاگر ہو۔ اس کے علاوہ شاعری کے خارجی اور داخلی حسن کو پہچانتے ہوئے اچھی اور بری شاعری کے درمیان وہ تمیز کر سکے۔ سالِ اوّل کے نصاب میں غزل کی تعریف اور اس کی انفرادی خصوصیات کو واضح کیا گیا تھا۔ سالِ دوم کے نصاب میں نظم کی تعریف اور اس کی امتیازی صفات کو شامل کیا گیا ہے۔ اس لئے متعلم اساتذہ کو پہلے پہل غزل اور نظم کا فرق پہچانتے ہوئے مختلف قسموں کی نظموں اور جدید نظم کی خصوصیات سے واقفیت پیدا کرنی چاہئے۔ اس سلسلے میں درج ذیل نکات طلبہ و طالبات کے ذہن نشین کرائے جا سکتے ہیں۔

غزل اور نظم کا فرق: ان دونوں میں کافی فرق پایا جاتا ہے۔ سب سے پہلا فرق یہ ہے کہ غزل کا ہر ایک شعر اپنے آپ میں مکمل اور جدا ہوتا ہے۔ جبکہ نظم میں تمام شعر ایک دوسرے سے جڑے ہوتے ہیں۔ دوسرا فرق یہ ہے کہ غزل کے ہر شعر میں ایک بات ہوتی ہے جبکہ نظم میں شروع سے آخر تک ایک ہی خیال کو تسلسل کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے۔ ان دونوں میں تیسرا فرق یہ ہے کہ غزل کی ایک مخصوص ہئیت ہوتی ہے جبکہ نظم کی کوئی ایک مخصوص ہئیت نہیں ہوتی۔ نظم الگ الگ ہئیتوں میں لکھی جاتی ہے۔ ایک اور فرق ان میں یہ ہے کہ نظم کا کوئی نہ کوئی عنوان ہوتا ہے۔ جو موضوع کی مناسبت سے رکھا جاتا ہے۔ اس کے برخلاف غزل کا کوئی عنوان نہیں ہوتا۔

نظم کے موضوعات: نظم کے لئے موضوعات کی کوئی قید نہیں۔ زندگی کا کوئی بھی موضوع نظم کا موضوع ہوسکتا ہے۔ نظم کے لئے اشعار یا بند کی تعداد بھی مقرر نہیں ہے۔ نظم مختصر سے مختصر بھی ہوسکتی ہے اور طویل سے طویل بھی۔

اردو کے اہم نظم نگار: نظیر اکبرآبادی، محمد حسین آزاد، حالی، شبلی، اقبال، اسمٰعیل میرٹھی، اکبرالہ آبادی، چکبست، سرور جہاں آبادی، عزیز لکھنوی، آثر لکھنوی، تلوک چند محروم، سردار جعفری، جوش ملیح آبادی فیض، جذبی، مخدوم، اختر شیرانی، جمیل مظہری، حفیظ جالندھری، میراجی، ن۔م۔راشد، اختر الایمان، منیب الرحمٰن، عمیق حنفی، زبیر رضوی، بلراج کومل، شہریار، خلیل الرحمٰن اعظمی، شاذ تمکنت وغیرہ۔

اردو کی چند مشہور نظمیں: کلجگ، آدمی نامہ، برسات کی بہاریں، مناجات بیوہ، مسدس حالی، مٹی کا دیا، عدل جہان گیری، شکوہ جواب شکوہ، ترانۂ ہندی، نیا شوالہ، خضرِ راہ، مسجد قرطبہ، سلمیٰ، عذرا، نوالہ، تنہائی، آوارہ، داشتہ، ایک لڑکا، کسان سوداگر، امرت، ایکتا وغیرہ۔

شعر فہمی کی صلاحیت پیدا کرنا: وہ منظوم کلام جس میں انسانی جذبات وتجربات موزونیت کے ساتھ خوبصورت الفاظ اور دلچسپ انداز میں پیش ہوئے ہوں اور جسے سن کر انسان کے جذبات متحرک ہو اُٹھیں اور دل ودماغ میں شادمانی کی لہر دوڑ جائے، شاعری کہلاتا ہے۔ شاعری کا مقصد زندگی کے اصل رنگ وروپ کو نہایت ہی تاب وتوانائی کے ساتھ سامنے لانا ہے اور لذت ومسرت پہنچانا ہے۔ اس کے علاوہ زندگی کے متعلق پڑھنے والوں کو ایک نئی بصیرت بھی عطا کرنا ہے۔ اس طرح جو شاعر اپنی شاعری میں مسرت سے بصیرت تک کا سفر بحسن وخوبی طے کرتا ہے۔ وہی شاعر کامیاب کہلاتا ہے۔ شاعر اپنے جذبات، احساسات اور تجربات کو بیان کرنے کے لئے تشبیہات، استعارات، علامات اور ضائع وبدائع کی مدد لیتا ہے۔ چنانچہ اسے بھی اچھے شعر کو سمجھنے اور اس سے محظوظ ہونے کے لئے ان اصطلاحات سے واقفیت ضروری ہے۔

تشبیہ: اس کے لفظی معنیٰ ہیں۔ باہمی مشابہت، اصطلاح میں دو مختلف چیزوں کے درمیان مشابہت یا اشتراک تلاش کرنے کا نام تشبیہ ہے۔ مثلاً سیب کی ایک خصوصیت ہوتی ہے کہ اس کا رنگ سرخ ہوتا ہے۔ اب اگر کسی عورت کے بارے میں کہا جائے کہ اس کے گال سیب جیسے ہیں تو اس کا یہ مطلب ہوگا کہ اس عورت کے رخسار میں وہ خوبی پائی جاتی ہے۔ جسے سرخی کہتے ہیں۔ ایک مثال اور دیکھئے۔

نازکی اس کے لب کی کیا کہئے پنکھڑی ایک گلاب کی سی ہے

اس شعر میں محبوب کے لب کی تشبیہ گلاب کی پنکھڑی سے دی گئی ہے۔ کیونکہ دونوں میں ایک جیسی خصوصیت یعنی نزاکت (کوملتا) پائی جاتی ہے۔

استعارہ: تشبیہ کی طرح استعارہ بھی دو مختلف چیزوں کے درمیان مشابہت ڈھونڈنے کا نام ہے۔ فرق یہ ہے کہ تشبیہ کے برعکس اس میں حرفِ شبہ یعنی جیسے، طرح، مثل، مانند وغیرہ الفاظ استعمال نہیں ہوتے۔ مثلاً یہ کہا جائے کہ زندگی سمندر کی طرح ہے تو یہ تشبیہ ہوگی اور اگر یہ کہا جائے کہ یہ زندگی کا سمندر ہے تو یہ استعارہ کہلائے گا۔

علامت : ایک چیز کی جگہ دوسری چیز کولانے کا نام علامت ہے مثلاً سرخ رنگ انقلاب اورخون خرابے کی علات ہے۔ ہرارنگ امن وشانتی کی علامت ہے۔ اسی طرح شاعری میں گل محبوب کی علامت بن کر آتا ہے اور بلبل عاشق کی علامت، اردوغزل میں کچھ علامتیں کثرت سے استعمال ہوتی ہیں۔ جیسے گل وبلبل، شمع وپروانہ، رند، زاہد، ناصح، ساقی، ساغر، مینا، نشیمن، آشیانہ، قفس، صیّاد، برق وغیرہ۔

صنائع وبدائع : شاعری کوسجانے، سنوارنے اوراس کی دلکشی اورمعنویت کو بڑھانے کے لئے جب کچھ خاص طرح کے الفاظ ایک خاص انداز سے استعمال کئے جاتے ہیں، تو وہ ضائع وبدائع کہلاتے ہیں۔ ضائع جمع ہے۔ صنعت کی۔ صنعت کے لفظی معنی ہیں کارگری کے۔ اصطلاح میں صنعت شاعری کی اس خوبی کو کہتے ہیں۔ جس سے شعر میں لطافت اورحسن پیدا ہونے کے ساتھ ساتھ معنی میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔ یعنی صنعتوں سے شعر کا تاثر بڑھتا ہے اور یہ تاثر کلام کی خوبصورتی اورمعنویت دونوں کو بڑھانے میں معاون ثابت ہوتا ہے۔ صنعتیں دوطرح کی ہوتی ہیں۔

(۱) لفظی صنعت (صنائع لفظی) (۲) معنوی صنعت (ضائع معنوی)

وہ خوبیاں جو الفاظ میں پائی جاتی ہیں۔ انہیں ضائع لفظی اور وہ خوبیاں جو معنی میں پائی جاتی ہیں انہیں ضائع معنوی کہتے ہیں۔ ان شعروں کو دیکھئے:۔

آدمی کہتے ہیں جس کو ایک پتلا کل کا ہے　　پھر کہاں کل اس کو گر کل ہو ذرا بگڑی ہوئی

روتے روتے کون سویا خاک پر　　ہنستے ہنستے کس کا جھولا رہ گیا

کیونکر اس بُت سے رکھوں جانِ عزیز　　کیا نہیں ہے مجھے ایمان عزیز

ابن مریم ہوا کرے کوئی　　میرے دُکھ کی دوا کرے کوئی

پہلے اور دوسرے شعر میں لفظی صنعت ہے اور تیسرے اور چوتھے شعر میں معنوی صنعت۔

نغمگی وداخلیت غزل کی دوسری بنیادی خوبیاں ہیں۔ جن کی بدولت غزل کا شعر سیدھے دل میں اتر جاتا ہے اور انسان کے رگ وپے میں کیف ومسرت کی لہر دوڑا دیتا ہے۔ غزل کے اشعار کی تعداد متعین نہیں ہے۔ عام طور پر پانچ سے انیس اشعار تک کی غزلیں ملتی ہیں مگر ایسی غزلوں کی بھی کمی نہیں ہے جن میں انیس سے زیادہ اشعار موجود ہیں۔

شعر فہمی کی مثال: شعر کے پہلے مصرعہ کا سمجھ لینا ضروری ہے کیونکہ دو مصرعوں کے مجموعہ کا نام شعر ہوتا ہے۔

مصرعہ : کلام موزوں کا ایک ٹکڑا جو کسی خاص مضمون پر ختم ہوتا ہو مگر یہ ضروری نہیں کہ مصرعہ کسی مضمون پر ختم ہی ہو جائے بلکہ اُس کا بقیہ دوسرے مصرعہ میں بھی شامل ہو جاتا ہے۔ یا اس کا ناتمام حصہ دوسرے مصرعہ میں پورا کیا جاتا ہے۔ دونوں مصرعوں کی مثالیں حسب ذیل ہیں۔

(۱) مصرعۂ تمام : ''جگہ جی لگانے کی دنیا نہیں ہے'' (۲) مصرعۂ ناتمام: ''میر اُن نیم باز آنکھوں میں''

نمبر (۱) میں پورا مضمون ختم ہو جاتا ہے۔ مگر نمبر (۲) میں ضرورت باقی رہ جاتی ہے کہ اُن نیم باز آنکھوں میں کیا بات ہے؟

الغرض مصرعہ کے بعد شعر کی نوبت آتی ہے۔ شعر میں دو مصرعے ہوتے ہیں۔ جو مل کر کسی مضمون کو ختم کرتے ہیں۔ کسی شعر کے لئے اُس کا ہم قافیہ یا ہم ردیف ہونا ضروری نہیں ہے۔ صرف دو مصرعے ایک ہی وزن کے اگر ملا کر پڑھے جائیں تو وہ بھی شعر کہا جائے گا۔ مثلاً

بڑے شوق سے سُن رہا تھا زمانہ ہمیں سو گئے داستان کہتے کہتے

غزل میں بات براہِ راست اور سیدھے سادھے طریقے سے نہیں کہی جاتی، بلکہ گھما پھرا کر، ڈھکے چُھپے انداز میں اشارے و تمثیلات کے ذریعے کہی جاتی ہے اور اس خصوص میں غزل تمام دوسری اصناف سے مختلف اور ممتاز ہے۔ اس لئے ہر ممکن موقع پر یہ امر واضح کرنا ہوگا کہ لیلیٰ مجنوں، دار و منصور، طور و کلیم، گل و بُلبل، شمع و پروانہ، مرغ و قفس، برق و شرر، شاخ و آشیاں، جام و صہبا، دام و صیّاد، اسیر و زندان، دیوانہ و صحرا، منزل و کاروان، ذرہ و آفتاب اور اس نوع کے دوسرے بہت سے کلمات جو اردو غزل میں عامتہ الورود ہیں۔ محض کچھ الفاظ یا لفظی ترکیبیں نہیں ہیں۔ بلکہ غزل کی شعری روایت کے مخصوص علائم و رموز ہیں۔ ان کلمات کو اُن کے لغوی و لفظی معنوں میں استعمال کرنا جائز نہیں ہوگا، کیونکہ غزل میں یہ اپنے محدود لغوی معنوں میں استعمال نہیں کئے جاتے۔ مثلاً میرؔ کا یہ شعر

ابتدائے عشق ہے روتا ہے کیا آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا

شعر کا ظاہری مطلب یہ ہے کہ ابھی تو عشق کی ابتداء ہے اور مصیبت کا صرف آغاز ہی ہوا ہے۔ آگے چل کر نہ جانے کیا کیا پیش آنے والا ہے۔ یہ جو تو نے ابھی سے آہ و زاری اور نالہ و فریاد کا سلسلہ شروع کر دیا ہے تو شاید تجھے یہ معلوم ہی نہیں کہ اس کوچے میں کیسی کیسی اُفتادیں پڑتی ہیں۔ اور انسان کو کیا کچھ جھیلنا پڑتا ہے۔ یہ اس شعر کے محض لفظی معنی ہیں۔ حقیقی مفہوم تک پہنچنے کے لئے ہمیں شعری علامت کے پردے کو ہٹا کر دیکھنا ہوگا۔ دراصل عشق اور گریۂ عشق کی

وساطت سے شاعر اس حقیقت کا اظہار کر رہا ہے کہ کسی بھی بڑے کام کا بیڑا اُٹھانا بے شمار نادیدہ آفتوں کو دعوت دینے کے مترادف ہوگا۔ یا یہ کہ ہر کام شروع میں آسان معلوم ہوتا ہے لیکن آگے چل کر طرح طرح کی پیچیدگیوں اور دشواریوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔

(ب) افسانے کی تحسین شناسی Appreciation of Short Story:

جس طرح اردو شاعری میں غزل کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔اسی طرح اردو نثر میں افسانے کو بھی وہی اہمیت وفضیلت حاصل ہے۔افسانہ نگاری کا فن دریا کو کوزے میں بند کرنے کا فن ہے۔ایجاز اور اختصار اس کی اہم خصوصیت ہے اور ایک انگریزی کہاوت کے مطابق اختصار ذہانت کی آتما ہے یعنی زندگی کے کسی پہلو کو جامعیت اور اختصار کے ساتھ کہانی کے فن کو مجروح کئے بغیر بیان کرنا ہی کسی بھی افسانہ نگار کا کمال ہے۔

اچھے اور برے افسانے کا فرق : اچھے اور برے افسانے کا فرق کیسے کیا جائے اور اچھے افسانوں کی شناخت کر کے اس کی تحسین کس طرح کی جائے وہی اس باب کا موضوع ہے۔جس طرح ہر چیز کا خارجی اور داخلی پہلو ہوتا ہے۔اسی طرح ہر اچھے افسانے کا بھی خارجی اور داخلی روپ ہوتا ہے۔افسانے کا موضوع ، پلاٹ ، کردار نگاری ، مکالمہ نگاری اور منظر نگاری اس کے خارجی روپ ہیں اور افسانے کے واقعات اور کرداروں کے احساسات کے ذریعہ جو وحدت تاثر پیدا کیا جاتا ہے اور افسانہ نگار جس طرح بالواسطہ طریقے سے اپنے نقطۂ نظر کو واضح کرتا ہے۔ وہ افسانے کا داخلی روپ کہلاتے ہیں۔ایک اچھا افسانہ ایک مرصع غزل کی طرح ہوتا ہے۔ایک ایسی غزل جو لمبی بحر میں لکھی جاتی ہے اور یہ غزل مسلسل ہوتی ہے،جس طرح ایک اچھے شعر میں شاعر بہت کچھ کہہ کر بھی بہت سی باتیں اَن کہی چھوڑ دیتا ہے۔ اسی طرح ایک اچھے افسانے کی صفت بھی یہی ہوتی ہے۔ ایک اچھا افسانہ پڑھنے والے (قاری) کو دعوتِ فکر دیتا ہے۔ یہاں زیادہ تر کہی ہوئی باتوں سے ان کہی بات کی اہمیت زیادہ ہوتی ہے۔افسانہ نگار کا کمال یہ ہے کہ کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ بات کہے۔کسی بھی ادب پارے کا چاہے وہ نظم میں ہو یا نثر میں اس کا مقصد یہی ہوتا ہے کہ وہ پڑھنے والوں کے سوچنے کے عمل کو فروغ دے۔افسانے کے فن کو بہتر طور پر سمجھنے کے لئے ہم کو مختلف قسم کے افسانے پڑھنا چاہئے۔ ہر افسانے کا موضوع جُدا،اس کے کردار مختلف اور اس کی تکنیک الگ ہوتی ہے۔

موضوع اور پلاٹ : افسانے پڑھتے ہوئے سب سے پہلے اس کا موضوع متعین کرنا چاہئے اور پھر اس کے پلاٹ

پرغور کرنا چاہئے۔افسانوں کے لئے موضوعات کی کمی نہیں ہے۔زندگی کے اندر اتنے موضوعات بھرے پڑے ہیں کہ ان کو سمیٹا نہیں جاسکتا۔ایک ہی موضوع یا ایک ہی واقعہ پر مختلف افسانہ نگاروں نے مختلف طریقے سے کہانیاں لکھی ہیں۔ ہندوستان کی تقسیم کے موضوع ہی کو لیجئے۔اس سلسلے میں کرشن چندر کا افسانہ ''ہم وحشی ہیں'' راجندر سنگھ بیدی کا افسانہ ''لاجونتی'' اور سعادت حسن منٹو کا افسانہ ''ٹوبہ ٹیک سنگھ'' اس کی بہترین مثال ہیں۔ایک ہی موضوع کے تعلق سے مختلف افسانہ نگاروں کا رویہ مختلف اور نقطۂ نظر جداگانہ ہے۔افسانے کا موضوع خود اپنی ہئیت تلاش کرتا ہے۔اس کی شکلیں مختلف ہوسکتی ہیں اسی کو ہم افسانے کے پلاٹ کا نام دے سکتے ہیں۔اس سے افسانے کو ایک طرح کی فنی تنظیم ملتی ہے۔واقعات کو ترتیب حاصل ہوتی ہے اور یہ ترتیب ہی قصے کو آگے بڑھاتی ہے۔

کردار: کسی بھی افسانہ نگار کے فن کا کمال اس کی کردار نگاری میں ظاہر ہوتا ہے۔ ہمارے اطراف واکناف کی دنیا مختلف قسم کے کرداروں سے بھری پڑی ہے۔افسانہ نگار کا مشاہدہ ان میں سے کسی اچھوتے کردار کو چن لیتا ہے اور فطرتِ انسانی کی بوقلمونی کو بیان کرتا ہے، کسی انسان کا ایک ہی روپ نہیں ہوتا۔وہ بیک وقت بیٹا، شوہر اور باپ ہوتا ہے۔وہی کارخانے اور دفتر میں کام کرتا ہے۔وہ افسر بھی ہوسکتا ہے اور ماتحت بھی۔وہ کسی کا دوست اور کسی کا دشمن بھی ہوسکتا ہے۔ وہ فرد کی حیثیت سے منفرد ہے لیکن اس کے روپ علحدہ ہیں مختصر افسانہ اس کردار کا ایک آدھ روپ ہی پیش کرسکتا ہے۔افسانہ نگار اپنے افسانوں میں اپنے زمانے کی روح کو بھی اسیر کرسکتا ہے جسے روحِ عصر یا عصری حسیت سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔اس کے ذریعہ اس عہد کے سماج کی تصویر اور اس زمانے کے عوام کے جذبات، احساسات اور تمناؤں کے ساتھ سماجی نفسیات اور سماجی کشمکش کو پیش کیا جاتا ہے۔ پریم چند، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، عصمت چغتائی اور سعادت حسن منٹو کے افسانے اپنے عہد کی تصویر بخوبی پیش کرتے ہیں اور ان میں ایسی باتوں کا بھی ذکر ہے جو تاریخی کتابوں میں بھی نہیں ملتے۔

اردو کے اہم افسانوں کا جائزہ: مذکورہ بالا نکات کی روشنی میں ہم اردو کے چند اہم افسانوں کا ذکر مختصراً کریں گے تاکہ اس سے افسانے کو پڑھنے سمجھنے اور اس سے لطف اندوز ہونے میں مدد ملے۔

قاتل : اردو کے عظیم افسانہ نگار پریم چند کے افسانے ''قاتل'' کو پڑھئے۔ پڑھنے کے بعد اس کا موضوع متعین کیجئے۔اس افسانے کا موضوع تشدد اور عدم تشدد یا ہنسا اور اہنسا (Violence and Non-Violence) کے

درمیان کشمکش ہے اس کے کردار دو ہی ہیں اس افسانے کا مرکزی کردار دھرم ویر تشدد کا علمبردار ہے اور اس کی ماں عدم تشدد کی نمائندگی کرتی ہے اور کہانی کا پس منظر بیسویں صدی کے اوائل کا زمانہ ہے جب تحریکِ آزادی چل رہی تھی، اس زمانے کے عوام میں ایک ذہنی کشمکش تھی کہ آزادی کے حصول کے لئے کون سا راستہ اختیار کیا جائے یعنی تشدد کا راستہ یا عدم تشدد کا راستہ۔ پریم چند نے اس کشمکش کو ایک کہانی کا روپ دے کر دو ہی کرداروں کی صورت میں اپنے عہد کی تصویر کو پیش کر دیا ہے۔ پریم چند نے اس افسانے میں اپنی طرف سے کچھ نہ کہہ کر بھی یہ کہہ دیا ہے کہ تشدد کا راستہ ہمارے ملک کی قدیم روایات کے خلاف ہے اور یہ انسانی تباہی کا راستہ ہے۔ انھوں نے ایک طرح سے اپنے گاندھی واد ہونے کا ثبوت دیا ہے۔ لیکن اپنے نقطۂ نظر کو اوپر سے مسلط کرنے کی کوشش نہیں کی بلکہ اس کہانی کا جو تاثر حاصل ہوتا ہے۔ جسے وحدتِ تاثر کہا جاتا ہے۔ اس سے یہی تمام باتیں قاری خود بخود سمجھ جاتا ہے۔

کالو بھنگی : اردو افسانوی ادب کے دوسرے ستون کرشن چندر کے افسانے ''کالو بھنگی'' کا مطالعہ کیجئے تو اندازہ ہوتا ہے کہ کسی کہانی کے بغیر بھی کس طرح ایک عمدہ افسانہ لکھا جا سکتا ہے۔ یہ کہانی سماج کے نچلے طبقے کے فرد خاک روب کی ہے جسے لوگ نفرت اور حقارت سے دیکھتے ہیں جسے سماج کا فرد نہیں بلکہ مشین تصور کیا جاتا ہے۔ جس سے لوگ اپنی گندگی، بول و براز تو اٹھواتے ہیں لیکن اس سے کوئی تعلق یا رشتہ استوار نہیں کرتے۔ اس سے ہاتھ لگنے اور چھونے سے بھی پرہیز کرتے ہیں۔ اس طرح اس کہانی کا موضوع متعین ہو جاتا ہے۔ اس کہانی کا کردار بھی ایک ہی ہے جس کی کوئی کہانی نہ ہوتے ہوئے بھی ایک کہانی ہے۔ اس افسانے میں روایتی انداز کا پلاٹ نہیں ہے۔ اس میں ایک کردار کو لے کر اس کی شخصیت کے مختلف پہلو جس طرح بیان کئے گئے ہیں۔ وہ کرشن چندر جیسے اعلیٰ افسانہ نگار ہی کا کام ہے کرشن چندر نے اپنے قلم کے جادو سے ایک معمولی کردار کو غیر معمولی بنا دیا ہے۔ اس طرح اس کہانی کے مطالعہ سے جو بات سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ بغیر پلاٹ کے بھی افسانہ لکھا جا سکتا ہے اور ایک ہی کردار کے بل بوتے پر بھی افسانے کی عمارت کھڑی کی جا سکتی ہے۔ اس کے ذریعہ افسانہ نگار نے جو تاثر دیا ہے وہ یہی ہے کہ سماج کے ادنیٰ سے ادنیٰ فرد کی بھی اپنی اہمیت ہوتی ہے اور اس کی بھی ایک شخصیت ہوتی ہے۔ اس طرح انسان دوستی کا پہلو اُبھر کر آتا ہے

ٹوبہ ٹیک سنگھ: اردو افسانوی ادب کی عمارت کے ایک اور اہم ستون سعادت حسن منٹو کا افسانہ ''ٹوبہ ٹیک سنگھ'' کئی لحاظ سے امتیازی خصوصیات کا حامل ہے ویسے اس میں انھوں نے پاگلوں کی نفسیات کو موضوع بنایا ہے اور ملک کی تقسیم

کے موضوع پر لکھی گئی یہ غالباً سب سے خوبصورت کہانی ہے۔ یہ تقسیم ہند کے خلاف ایک بلیغ احتجاج ہے فن کے لحاظ جو بات اہمیت رکھتی ہے وہ یہ ہے کہ اس میں ایک مقام یا علاقے کو مرکزی حیثیت دی گئی ہے۔

اس کہانی کا کردار ایک پاگل جوٹو بہ ٹیک سنگھ نامی مقام کا رہنے والا ہے وہ یہ جاننا چاہتا ہے کہ ٹوبہ ٹیک سنگھ تقسیم کے بعد ہندوستان میں رہے گا یا پاکستان میں ۔اس طرح تقسیم ملک کے وقت جو غیر یقینی صورتِ حال پیدا ہوگئی تھی اس کے متعلق یہ افسانہ ایک علامت کی حیثیت اختیار کر گیا ہے۔منٹو کی اس کہانی کے مطالعہ سے جو بات سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ کس طرح ایک فنکار کا مشاہدہ اور انسانی نفسیات سے اس کی واقفیت خوب صورت کہانی کو جنم دیتی ہے۔افسانے کی سب سے بڑی صفت اس کا ایجاز اور اختصار ہے اور یہ خوبی منٹو کے ہاں بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے۔

اپنے دکھ مجھے دیدو : جدید اردو افسانوی ادب کا ایک اور اہم نام راجندر سنگھ بیدی کا ہے۔ان کے افسانے عام انسانی نفسیات خصوصاً ہندوستانی عورت کی نفسیات کے مطالعے پر مبنی ہوتے ہیں ان کے افسانوں میں ہندوستانی سماج کی تصویر کشی میں خصوصی طور پر متوسط طبقے کی زندگی کی کشاکش کو بحسن وخوبی پیش کیا گیا ہے۔راجندر سنگھ بیدی کی کہانی ''اپنے دکھ مجھے دیدو'' نہ صرف ان کی بہترین کہانیوں میں سے ہے بلکہ اس کا شمار اردو کے بہترین افسانوں میں کیا جاتا ہے۔

اس کہانی کا موضوع ہندوستانی عورت ہے جو تیاگ اور قربانی کی نشانی سمجھی جاتی ہے۔بیٹی بہن بیوی اور ماں اس کے چار اہم روپ ہیں وہ چاہے بیٹی ہو یا بہن، بیوی ہو یا ماں وہ دینا ہی جانتی ہے۔وہ دوسروں کو سُکھ دیتی ہے اور اُس کے بدلے دُکھ اپناتی ہے۔اس کہانی کی ہیروئن اِندو کی شادی مدن سے ہوتی ہے۔شادی کی پہلی رات اپنے شوہر سے وہ کہتی ہے کہ ''تم اپنے دکھ مجھے دے دو'' اس طرح وہ مدن ہی کے نہیں اُس کے خاندان کے سارے دُکھ اور غم اپنے سر لے لیتی ہے۔مدن کی ماں نہیں ہے۔اس کے باپ، بھائی اور بہن کی ذمہ داری اپنے سر لے لیتی ہے۔باپ کی دن رات خدمت کرتی ہے۔چھوٹے بھائی اور بہن کی پرورش کرتی ہے۔آخر میں اُن کی شادی بھی کرواتی ہے، دوسری طرف مدن کو شکایت ہوتی ہے کہ اندو، اُس کا خیال نہیں کرتی۔اس طرح مدن کو اپنی فکر ہے۔جب کہ اندو کو سب کی فکر ہے۔اس دوران خود اُس کو بچی ہوتی ہے وہ بھی بڑی ہو جاتی ہے۔شادی کے پندرہ سال بعد وہ جب اپنی زندگی کو پلٹ کر دیکھتے ہیں تو وہ کہتی ہے کہ میں نے تمہارے سارے دُکھ تو لئے تھے۔لیکن بدلے میں سُکھ نہیں دئے۔لیکن دوسرے الفاظ میں کسی کے دُکھ لینا ہی سب سے بڑا سُکھ ہے یہی اِس کہانی کا پیغام ہے۔

حصّہ دوّم

V - اردو زبان کی تدریس کے طریقۂ کار

Methodology of Teaching of Urdu Language

ا۔تدریس زبان کے اُصول: (Principles of Language Teaching)

تدریس زبان ایک فن ہے جس میں مہارت حاصل کرنے کے لئے با قاعدہ چند اصول وضع کئے گئے ہیں۔ کامیاب مدرس کے لئے ان اُصولوں پر کاربند ہونا ناگزیر ہے۔زبان کی تدریس کے لئے بنیادی طور پر دو قسم کے اُصول ہیں کلّی اور جزوی کلّی اُصول جزوی اصولوں سے زیادہ اہم ہیں۔

کلیات کی مختلف صورتیں ہیں۔

(الف) رہنما اصول: تدریس زبان کے لئے ضروری ہے کہ

ا۔مقصدِ تدریس کا تعین کیا جائے۔ (۲) طلباء کی فطرت اور ماحول کا مطالعہ کیا جائے۔

۳۔مقصد کے مطابق نصاب زبان کا تعین کیا جائے (۴) مدتِ تدریس اور وقت نامہ کے لحاظ سے زبان کی تقسیم کی جائے ۵) اسباق کی نوعیت کو پہلے سے جانچ لیا جائے۔(۶) سبق کے متعلق پہلے سے اشارات تیار کرا لئے جائیں۔

(ب) بنیادی اُصول: بنیادی اُصول وہ ہیں جن پر تدریس زبان کا اساس اور انحصار ہے۔اُن اصولوں کا اثر تدریس زبان کے سلسلے میں ہمہ گیر ہے۔

ا) طلباء کے عمل اور اُن کی ذاتی سعی پر زیادہ زور دیا جائے۔ ۲) تدریس عمل کو روزمرّہ زندگی سے خاص طور پر مربوط کیا جائے۔۳) جہاں تک ہو سکے مقرونیت یعنی اشیائے محسوسہ،نمونوں،تصویروں،خاکوں،واقعات اور مثالوں کے ذریعے موضوع تدریس کا تصور طلباء کے ذہین نشین کرایا جائے۔(۴) تدریس زبان کے ہر اقدام میں زبان پر توجہ مرکوز رہے۔(۵) اجتماعیت یعنی تدریس زبان میں ایسے مواقع پیدا کئے جائیں کہ مل کر جماعت میں کام کریں۔

(۶) انفرادیت یعنی تدریس زبان میں ایسے مواقع مہیا کئے جائیں کہ طلباء انفرادی طور پر عمل پیرا ہوں۔

(ج) اقدامی اُصول: (ا) معلوم سے نامعلوم کی طرف (۲) آسان سے مشکل کی طرف (۳) غیر معین اور غیر واضح

سے معین اور واضح کی طرف (۴) مقرون سے مجرد کی طرف (۵) خاص سے عام کی طرف۔(۶) منطقی تدبیر اور نفسیاتی ترتیب کا لحاظ۔

(د) تدبیری اُصول: تدبیری اُصول وہ ہیں جن سے تدریس کو مؤثر، واضح اور دلچسپ بنانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ ان تدابیر میں سوالات، جوابات، توضیحات، گھر کا کام، درس کتب، خاموش مطالعہ، کتب خانہ، قصّہ گوئی، تمثیل اور سمعی بصری تدابیر، مثلاً ریڈیو، ٹیپ ریکارڈر اور ڈی وی ڈی پلیئر وغیرہ شامل ہیں۔

زبان کی تدریس کا نیا طریقہ کار

زبان کی تعلیم و تدریس میں روایتی طریقۂ کار کی ناکامی کی وجہ سے ماہرین تعلیم نے زبان کی تدریس کے لئے ایک نیا طریقۂ کار تشکیل دیا ہے۔ جس کا مقصد طلبہ میں نیا طرز فکر پیدا کرنا، تعلیمی سرگرمیوں کے ذریعہ فطری اور غیر رسمی ماحول میں بچوں کو زبانوں کے سننے، بولنے اور استعمال کرنے کے مواقع فراہم کرنا ہے۔ بچے فطری طور پر کھیل کے شائق ہوتے ہیں۔ وہ آزادی چاہتے ہیں۔ وہ کسی طرح کے ذہنی دباؤ اور جسمانی تکلیف کو پسند نہیں کرتے۔ بچوں میں مشاہدہ کرنے، مقابلہ کرنے، تجزیہ کر کے کسی نتیجے پر پہنچنے کا فطری جذبہ ہوتا ہے۔ اسی لئے تعلیم کو زیادہ موثر، دلکش اور کارگر بنانے کے لئے مبنی بر عمل اکتساب (Activity Based Learning) کو اہمیت دی گئی ہے۔ نئے طریقۂ تعلیم میں بچوں کو مرکزیت حاصل ہے اس طریقۂ کار کے تحت بچوں کی تخلیقی صلاحیت ابھارنے کے مختلف مواقع فراہم کئے جاتے ہیں۔ اب زبان کے اسباق کی تدریس کے دوران کلاس روم میں استاد اور طالب علم دونوں کے رول بدل گئے ہیں۔ طریقۂ تدریس تعلیمی ماحول اور وسائل تعلیم کے تصور میں جو تبدیلی آئی ہے۔ وہ اس طرح ہے :

ا۔ زبان ایک نظام ہے۔ (۲) زبان کی تعلیم غیر شعوری عمل ہے۔ (۳) بچے کے ذہن میں زبان کا ایک خاکہ موجود رہتا ہے جو کسی خاص زبان کا نہیں۔ (۴) بچہ ماحول اور مواقع کے زیر اثر مختلف تجربات سے زبان سیکھتا ہے۔

(۵) جدید طریقۂ تدریس میں بچوں کو مرکزیت حاصل ہے۔ (۶) تعلیمی سرگرمیاں عمل و حرکات پر زور دینے والی ہوں۔

(۷) طریقۂ تدریس مفہوم سے الفاظ کی طرف لانے والا ہو۔ (۸) تعلیمی سرگرمیاں ایسی ہوں جو غیر شعوری طور پر تعلیم کی ترغیب دیں۔ (۹) طریقۂ تدریس تخلیقی صلاحیت کو اُبھارنے والا ہو۔ (۱۰) زبان کی تدریس میں کام آنے والی تمام چیزوں میں درسی کتاب بھی ایک ہو۔ (۱۱) درسی کتاب کسی تعلیمی سرگرمی کے ذریعہ تیار کی گئی ہو۔ (۱۲) جن چیزوں کا بیان

ہو وہ بچوں کے لئے مانوس ہوں۔(۱۳) زبان کی تدریس میں ایک بچے کا دوسرے بچے سے تعلق، استاد اور بچے کے تعلق اور بچے کا سماج سے تعلق کو اہمیت دی جائے۔(۱۴) جملہ چیزیں بچوں کے استعمال کے لائق ہوں۔(۱۵) تعلیمی ماحول بچوں کی فطرت کے مطابق ہو۔

اردو زبان کی تعلیم کے ذریعہ بچوں میں مذہبی رواداری، سیکولر مزاج، جمہوریت، انسان دوستی، غم گساری، حب الوطنی اور قومی یکجہتی کے جذبات کو فروغ دیا جائے۔ نظم کی تدریس میں بچوں کو نظمیں انفرادی اور اجتماعی طور پر گا کر سنانے کی مشق کرائی جائے۔ نظم میں پیش کردہ خیالات پر مبنی تصویریں بنادی جائیں۔ زبان کے اسباق کے ذریعہ بچوں کو ایک ذمہ دار شہری بننے کے ساتھ اردو زبان میں اظہارِ خیال کرنے کے قابل بنایا جائے۔ زبان کی تدریس کے سلسلے میں لسانیات کا علم مفید اور کارآمد ثابت ہوسکتا ہے۔

مختلف لاحقوں کی مدد سے مرکب الفاظ بنانا

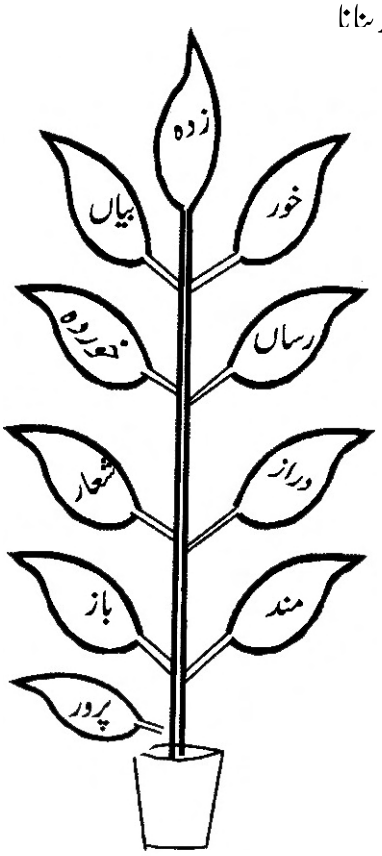

۱۔ فتح = ...

۲۔ کفایت = ...

۳۔ سُراغ = ...

۴۔ رشوت = ...

۵۔ شکست = ...

۶۔ گیسو = ...

۷۔ حیرت = ...

۸۔ بندہ = ...

۹۔ جادو = ...

۱۰۔ جاں = ...

جوابات: فتح مند، کفایت شعار، سراغ رساں، رشوت خور، شکست خوردہ، گیسو دراز، حیرت زدہ، بندہ پرور، جادو بیاں، جاں باز

VI - لسانیات Linguistics

تمہید: ''لسان'' عربی زبان کا لفظ ہے۔جس کے لغوی معنی زبان یا بھاشا کے ہیں۔زبان کے اصطلاحی معنی خیالات کے اظہار کا وہ وسیلہ جو ملفوظ آوازوں کے ذریعے ادا کیا جائے۔لسانیات ایک انگریزی اصطلاح کا ترجمہ ہے جو (Linguistics) کے مترادف ہے۔اس کے معنی ہیں۔وہ علم جو زبان سے متعلق جملہ امور کا احاطہ کرتا ہے۔اس کے تحت اپنی زبان کے علاوہ دوسری زبانوں کے بارے میں سائنسی اندازِ فکر سے مطالعہ کیا جاتا ہے۔لسانیات ایک مستقل علم ہے موضوع کے اعتبار سے بے حد اہم ہے۔اور وسیع بھی، زمانۂ قدیم میں ممکن ہے اس کا دائرہ تنگ ہو۔مگر علوم جدیدہ اور مختلف میدانوں میں تحقیقات کی بناء پر اس کی وقعت بڑھ گئی ہے۔لسانیات کا تعلق انسانی زندگی کا معاشرت اور تہذیب سے ہے۔اس کا مقصد انسان کی ذہنیت کا مطالعہ ہے تہذیبی ارتقاء کے سبب زبان میں کس طرح تغیرات رونما ہوئے۔ انسانی جماعت میں آپسی ربط و تعلق کے ضمن میں زبان کا کیا کردار رہا۔

زبانوں میں آپسی مماثلت کا حال دریافت کرنا اور معاشرہ پر زبان کے اثرات وغیرہ موضوعات لسانیات کے دائرہ میں آتے ہیں۔

علم لسانیات کی تعریف: مجموعی طور پر کہا جاسکتا ہے کہ لسانیات زبانوں اور ان کے متعلقات کا علم ہے۔جس کے تحت ایک یا ایک سے زیادہ زبانوں کی ساخت، الفاظ، جملے، ان کی بناوٹ، آوازیں، تلفظ کے علاوہ زبانوں کی پیدائش نشو ونما اور ان کے باہمی تعلق پر غور وخوص کیا جاتا ہے۔

علم لسانیات کے مقاصد: لسانیات کا علم گمنام زبانوں، قدیم کتبوں اور اساطیری تحریروں کو پڑھنے میں مدد پہنچاتا ہے۔اس کی بدولت زبان کے بولنے والوں کی تہذیبی وثقافتی حالت کا اندازہ ہوتا ہے۔لسانیات کی مدد سے ہم یہ معلوم کر سکتے ہیں کہ زبانیں کس طرح پیدا ہوتی ہیں، نشو ونما پاتی ہیں۔اور مرجاتی ہیں۔ان باتوں کے علاوہ علم لسانیات دیگر علوم کی شناسائی میں بھی معاون ہوتا ہے۔علم لسانیات کی مدد سے ہم کو علم نفسیات، علم آلاثار علم بشریات اور قدیم تاریخ کی تحقیقات کے لئے مواد فراہم ہوتا ہے۔

زبان کا وجود: زبان خدا کی عطا کردہ ایک عظیم نعمت ہے۔جو حیوانات کے مقابل انسان کے لئے برتری، فضلیت اور امتیاز کا باعث ہے۔اسی زبان کی وجہ سے آدمی حیوانِ ناطق اور دیگر جانور بے زبان کہلاتے ہیں۔زبانیں بنائی نہیں

جاتیں بلکہ فطرت کے کارخانے میں خود بخود بنتی ہیں۔زبانوں کی تشکیل کے لئے مشینوں اور کارخانوں کی ضرورت نہیں پڑتی ہے۔ بلکہ زبانوں کا فطری ارتقاء ازخود ہوتا رہتا ہے۔لیکن اس کے ساتھ ساتھ ارادی ارتقاء بھی زبانوں کے مزاجوں کو بدلنے اور ان کے رُخ کو موڑنے میں اہمیت رکھتا ہے۔

زبان کی تعریف : مختلف ماہرین لسانیات زبان کی تعریف مختلف انداز اور مختلف طریقوں سے کی ہے۔

گریرسن : زبان مختلف مگر باقاعدہ منقوطی علامات کا مجموعہ ہے۔جس سے خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے۔اس میں Local Symbols کا ایک بھرپور سلسلہ ہوتا ہے۔جسے Vehicle of expression of thoughts سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ہنری سوئچ (Henry Switch) نے زبان کو تکلمی آواز اور خیالات کے اظہار کا ذریعہ قرار دیا ہے۔اس کے نزدیک تکلم کے سبب جو آوازیں نکلتی ہیں اور جن سے خیالات کی ترجمانی ہوتی ہے وہی زبان ہے۔ ایڈورڈ سوپر (Edward Super) کا کہنا ہے کہ زبان اظہار اور تبادلہ خیال کا مکمل مربوط ذریعہ ہے۔جس میں گریرسن کے مطابق زبان اشاروں یا علامت مرکب کا نام ہے۔جن سے انسان اپنے ماضی الضمیر کا اظہار کرتا ہے۔ان تمام تعریفوں کی حیثیت اگرچہ الگ الگ ہے لیکن ان سب میں جو بات مشترک ہے وہ یہ ہے کہ انسان کے تصورات ہوں یا خیالات یا خواہشات۔وہ سب کے سب مخصوص آوازوں کے ذریعے ادا کئے جاتے ہیں۔

زبان کی نوعیت: زبان اپنی نوعیت کے اعتبار سے دو خانوں میں بٹی ہوئی ہے۔(۱) میکانکی یا عضویاتی (۲) نفسیاتی

زبان کی نوعیت

میکانیکی یا عضویاتی نفسیاتی

نوعیت کے اعتبار سے زبان اس وقت تک وجود میں نہیں آتی جب تک انسانی جسم کے مختلف اعضاء یا انسانی جسم کے مختلف پُرزے حرکت میں نہ آئیں۔انسانی جسم کے یہ پرزے یا اعضاء سیکڑوں ہیں۔جن میں نمایاں ترین زبان، پھیپھڑے، آواز کی نلّی، ناک، دانت، ہونٹ، تالو وغیرہ ہیں۔جبکہ نفسیاتی خانے میں زبان سے پیدا ہونے والے معنی ومطالب یعنی جو آوازیں انسانی جسم کے اعضاء سے بالارادہ نکالی جاتی ہیں۔ان کا تعلق انسانی ذہن سے ہے اور انسان کی نفسیات ان کلمات اور آوازوں کے اخراج کی ذمہ دار ہے۔

زبان کے پہلو: زبان کی نوعیت کی روشنی میں ماہرین لسانیات نے زبان کے دو پہلو قرار دئے ہیں۔

1. ملفوظی 2. تصوراتی

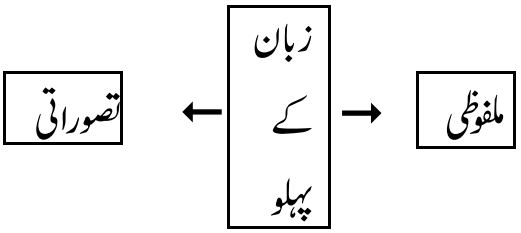

پہلی صورت کو شکل بھی کہتے ہیں اور دوسری صورت کو معنی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ مراد یہ ہے کہ زبان جب بولی جاتی ہے یا وجود میں آتی ہے تو اس کے دو پہلو ہر حال میں سامنے آتے ہیں۔ یعنی اس کا ایک روپ آوازوں کی تشکیل کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے اور دوسرا روپ ان آوازوں کے مقررہ معنی کا ہے۔ جو مختلف تصورات کی نشاں دہی کرتے ہیں جن سے کوئی مفہوم یا تصور وابستہ ہوتا ہے۔

زبان کی قسمیں :

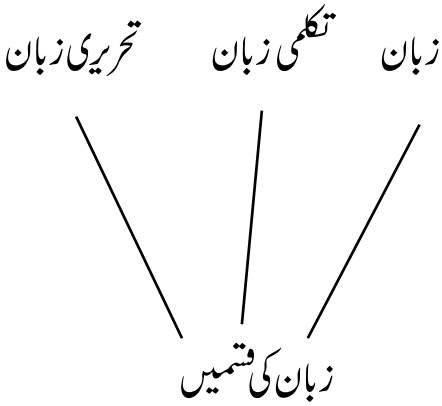

زبان کی تین قسمیں ہیں۔

1. اشاراتی زبان
2. تکلمی زبان
3. تحریری زبان

1. اشاراتی زبان: اسے انگریزی میں Primitive Language کہتے ہیں۔ اس میں زبان کے دونوں پہلو شکل اور معنی سے کوئی قسم کا ربط وضبط نہیں ہوتا۔ انسان بولنے اور لکھنے سے پہلے جو زبان استعمال کرتا ہے۔ وہ اشاراتی ہی تھی جس سے وہ اپنی بات کو دوسرے تک پہنچاتا تھا۔ لیکن اشاراتی زبان سے احساسات، جذبات، خواہشات اور نفسیات کی بھرپور ترجمانی ممکن نہیں۔

2. تکلمی زبان : ماہرین لسانیات تکلمی زبان کو ہی حقیقی زبان قرار دیتے ہیں۔ اس لئے کہ یہ زبان کا واضح ترین وسیلہ اظہار ہے اور اس سے تقریباً ہر بات کی کامل ترجمانی ہوتی ہے۔ لطیف احساسات دقیق خیالات اور رنگوں کی بھرپور ترجمانی جس قدر تکلمی زبان سے ممکن ہے وہ کسی اور زبان سے ممکن نہیں۔

3- تحریری زبان: یہ بھی زبان کی ایک ترقی یافتہ شکل ہے۔ لیکن یہ زبان خیالات کی اس حد تک ترجمانی نہیں کرسکتی جس حد تک تکلمی زبان سے ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر ہر تحریری زبان آواز کی ادائیگی اور انسانی لب ولہجہ کی بھرپور ترجمانی

نہیں کرسکتی البتہ اتنا ضرور ہے کہ تحریری زبان اشاراتی اور تکلمی زبان کے مقابلے میں زیادہ پائیدار ہوتی ہے۔تحریری زبان علم لسانیات کے مواد کی فراہمی کا اہم ذریعہ ہے۔ یہ زبان کے ارتقاء کا آخری زینہ ہے۔یعنی جب کوئی زبان ترقی کی انتہائی بلندیوں کو چھونے لگتی ہے۔تو وہ لکھی اور پڑھی جاتی ہے۔

زبان کی ماہئیت آغاز اور تشکیل:

ماہئیت : زبان خیالات کا ذریعہ اظہار ہے۔اس کا کام یہ ہے کہ لفظوں اور فقروں کی مدد سے انسانوں کے ذہنی مفہوم ودلائل اوران کے عام خیالات کی ترجمانی کرے۔پس زبان کی واضح تعریف ان الفاظ میں کی جاسکتی ہے۔کہ ''زبان انسانی خیالات اوراحساسات کی پیدا کی ہوئی ان تمام عضوی اور جسمانی حرکتوں اوراشاروں کا نام ہے۔جن میں زیادہ تر قوتِ گویائی شامل ہے۔اور جن کوایک دوسرا انسان سمجھ سکتا ہے۔اور جس وقت چاہے اپنے ارادے سے دوہراسکتا ہے۔

زبان کیوں کر پیدا ہوئی: انسانی خیالات اوراحساسات کے اظہار کے لئے زبان کیوں کر پیدا ہوئی ہے۔ یہ مسئلہ تفصیل طلب بھی اور نہایت دلچسپ بھی۔ دنیا کی تمام مختلف اور جدا جدا نسلوں کے قسم قسم کی خصوصیتیں رکھنے والے افراد میں ایک ہی فطرت انسانی کام کررہی ہے۔تو پھر یہ بھی سمجھا جاسکتا ہے کہ مختلف خاندان السنہ میں ایک ہی ابتدائی زبان یاایک ہی ابتدائی قبیلے کی بولی سے متفرع ہوئی ہیں۔غرض انسان میں کام لینے کی استعداداس کی خاص فطرت کی طرح یقیناً ایک ودیعت الٰہی ہے مگر زبان اس حدتک انسان کی اپنی کوششوں کا نتیجہ ہے۔کہ وہ اس خداداد صلاحیت کو اپنی فطرت اورعضوی خصوصیات کی مدد سے ظاہر کرتا ہے۔

.....

۱۔ .....تلے اندھیرا (دیوار۔درخت۔چراغ)

۲۔ حلوائی کی.....پردادا جی کی فاتحہ (قبر۔گھر۔دکان)

۳۔ ایک انار.....بیمار (سو، پچاس، ہزار)

۴۔ بوڑھی گھوڑی.....لگام۔ (سفید۔لال، کالی)

۵۔ .....چلا ہنس کی چال اپنی چال بھی بھولا (الّو۔کبوتر۔کوّا)

VII - زبان کا عمل اور اس کے مقاصد

Functions and Objectives of Language

زبان خدا کی عطا کردہ ایک عظیم نعمت ہے جو حیوانات کے مقابل انسان کے لئے برتری، فضیلت اور امتیاز کا باعث ہے اس زبان کی وجہ سے آدمی حیوان ناطق اور دیگر جانور بے زبان کہلاتے ہیں۔ زبان سماج اور تہذیب کی شیرازہ بندی کا ذریعہ ہے۔ انسان کے خیالات اور احساسات کے ترجمانی تین ہیں۔ اشارہ، تکلم اور تحریر۔ زبان کا تعلق دوسرے ذریعہ اظہار یعنی تکلّم سے ہے۔ اصطلاح میں زبان وہ مخصوص آوازیں ہیں جو انسان بالقدر نکالتا ہے۔ جن کے ذریعے اپنا مافی الضمیر ظاہر کرتا ہے۔ مشہور ماہر لسانیات ہنری سوئٹ کا بھی یہی خیال ہے۔ ''تکلم کے سبب جو آوازیں نکلتی ہیں اور جن سے خیالات کی ترجمانی ہوتی ہے، وہی زبان ہے۔'' مجموعی طور پر کہا جاسکتا ہے کہ زبان کو قوت گویائی یا تکلم کے مفہوم میں استعمال کیا جائیگا تو اس سے مراد وہ ملفوظ آوازیں ہوں گی۔ جو انسان بالا ارادہ ادا کرتا ہے۔ اور جب چاہے انھیں بار بار دہرا سکتا ہے۔ معینہ معنی میں یہ آوازیں اپنا مفہوم بدلا نہیں کرتیں۔ انسانی تہذیب کے ارتقا کے ساتھ حروف الفاظ اور جملوں کی شکل اختیار کرتے گئے۔ جنہیں تحریر سے تعبیر کیا گیا۔

تحریر : زبان کو تحریر کی شکل دینا انسانی ترقی، اس کے ذہنی عروج اور تہذیب وشائستگی کی علامت ہے۔ تحریر زبان کے ارتقاء کا نقطۂ آغاز قرار دیا جاسکتا ہے۔ تحریر کے ذریعے خیالات کا اظہار دو طریقوں سے کیا جاتا ہے۔ (۱) تصویر سے (۲) حروف سے یہ دونوں صورتیں زمانۂ قدیم سے آج تک کسی نہ کسی طریقے سے رائج ہیں۔

تصویری خط (Pictorial Writing): پہلے اقوام نے تصویریں بنانا سیکھا اس کے بعد تصویری خط ایجاد کئے۔ اچھی تصویر وہ سمجھی جاتی ہے جو اصل کی ہو بہو نقل ہو۔ عموماً ہر تصویر ایک لفظ کے قائم مقام ہوتی تھی۔

حروف : تحریر مختلف ادوار میں ارتقاء کی مختلف تدریجی منزلوں سے گذرتی ہوئی جب کمال کو پہنچی تو حروف کی شکل میں منضبط ہوئی۔ تحریر بھی ایک فرضی چیز ہے۔ یعنی آوازوں کو جنھیں انسان گفتگو میں استعمال کرتا ہے۔ جب علامت کے طور پر مقرر کردیا جاتا ہے۔ اور اس پر ایک مخصوص گروہ متفق ہوجاتا ہے۔ تو ان علامتوں کو حروف کا نام دیا جاتا ہے۔ انھیں اصطلاح میں حروف ہجّا یا حروف تہجی (Alphabatic Script) بھی کہا جاتا ہے۔ حروف کی ایجاد نے تحریر کے

مسائل آسان کردیئے۔حروف تہجی دراصل حروف صحیح (Vowels) اورحروفِ علّت (Consonants) کی الگ الگ علامتوں کے تعین کا نام ہے۔

زبان کا عمل اور اُس کے مقاصد (Function and Purpose of Language :

زبان کے تین اہم مقاصد ہیں جوحسبِ ذیل ہیں۔

(الف) رابطہ (Communication) (ب) اظہارِ خیال کا ذریعہ (Medium of Thought)

(ج) تمدن کی ترسیل (Transmission of Culture)

فرد اور سماج میں ایک مضبوط اور اٹوٹ رشتہ ہے دوسری مخلوقات کی طرح انسان بھی ایک مخلوق ہے۔اس کی بھی اپنی ضروریات ہیں اور زندہ رہنے اور زندگی گذارنے کے لئے ایک دوسرے سے ملنا جلنا اور تعلقات پیدا کرنا ناگزیر ہے۔

(الف) رابطہ: انسان نے اپنے وجود کی بقا کے لئے بہت ساری چیزوں کو اختراع اور ایجاد کیا ہے۔بعض چیزیں ضروریات کے تحت اور بعض چیزیں ازخود قدرتی طور پر ظہور پذیر ہوئی ہیں انسان پہلے اکیلا رہتا تھا۔لیکن جب خاندان کا وجود عمل میں آیا ہے اسے ایک دوسرے سے رابطہ قائم کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی اور اس ضرورت کے تحت زبان کی بنیاد پڑی۔اس طرح جب گروہ اور قبیلہ وجود میں آئے تو اس کے استعمال میں توسیع ہوتی گئی پہلے پہل انسان ایک دوسرے کے ساتھ حرکات وسکنات اور اشارات سے کام لینے لگا بعد میں اُن علامات نے بولی، حروف، لفظوں اور جملوں کی شکلیں اختیار کرلیں اور زبان کہلائیں۔

(ب) اظہار خیال: زبان اور اظہار خیال لازم وملزوم ہیں۔زبان اظہار خیال کا ذریعہ اور نفسیاتی کیفیت کی ترسیل کا آلہ ہے۔انسان زبان کے ذریعے اپنے خیالات دوسروں تک پہنچاتا ہے۔اوران کی باتوں اور خیالات کو خود سمجھتا ہے زبان ایک وسیلہ ہے۔جس کے ذریعے ہم اپنے دل کی کیفیتوں کو آسانی سے ظاہر کرسکتے ہیں۔زبان جذبات کے اظہار کا سب سے اعلیٰ ذریعہ ہے یہ جذبات کی سانسوں کی وہ خوشبو ہے جو اُڑ جائے۔تو گیت اُداس ہوجائیں گے۔

(ج) تمدن کی ترسیل :انسان کی معاشرت اور مدنیت کے لئے زبان ایک ناقابل انکار لازمہ ہے۔الفاظ میں قوموں کی تاریخ، تہذیب وتمدن اوران کے کردار اور جذبات کی صحیح تصویریں ملتی ہیں۔بعض الفاظ سے ان کی شرارتوں اور حماقتوں کا

بھی علم ہوتا ہے اور بعض الفاظ سے ان کی نفسیاتی، معاشرتی اور تہذیبی وتمدنی پس منظر کا پتہ چلتا ہے۔ زبان ایک قدرتی تخلیق اور فطرت کا عطیہ ہے۔ زبان کی پیدائش اور اس کا ارتقاء سماج وتہذیب کی پیدائش اور اس کے ارتقا کے ساتھ ہوتا رہتا ہے۔ جس طرح انسان کی اولاد سطح زمین پر مختلف سمتوں میں پھیل گئی اور الگ الگ گروہ میں بٹ کر اپنے خیالات کا اظہار کرتی ہے۔ اس طرح مختلف ماحول میں مختلف زبانیں وجود میں آئیں اور اپنے ساتھ مخصوص رجحانات وخیالات اور معاشرتی افکار بھی لائیں۔ اس طرح لسانی ماحول کے ساتھ ساتھ ایک تہذیبی اور تمدنی ماحول کی بھی تشکیل ہوتی گئی۔

ہر نئے مذہب نے نئے الفاظ کے ذخیرے دیئے ہیں۔ ڈاکٹر شکیل الرحمٰن نے اپنی تصنیف ''زبان وکلچر'' میں لکھا ہے۔ کہ سماجی کشمکش سے زبان پیدا ہوتی ہے اور زبان کی پیدائش سے انسان کو بہت سکون ملا اور اس کی بہت ساری پریشانیاں دور ہوگئیں۔ انسانی ارتقاء کے ساتھ ساتھ زبان بھی ترقی کرتی جاتی ہے۔ انسانی خیالات کے اُتار چڑھاؤ کے ساتھ ساتھ زبان میں بھی کچھ نہ کچھ تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ چنانچہ زبان انسانی تمدن کی ترسیل کا سب سے اہم وسیلہ ہے۔

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں
ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا
ہندی ہیں ہم، وطن ہے ہندوستاں ہمارا

کرو مہربانی تم اہل زمیں پر
خدا مہرباں ہوگا عرش بریں پر

VIII - زبان کا مجموعی ارتقاء

General Evolution of Language

عام طور پر زبان کے آغاز اوراس کی ماہیت کے علاوہ روزمرہ زندگی میں اس کے استعمال سے اساتذہ کو واقف ہونا ضروری ہے۔ اردو کے معلم کو نہ صرف اُردو زبان کے آغاز وارتقاء اوراس کی مبادیات کا علم ہو بلکہ زبان کے عمومی ارتقاء تکنیک اورزبان کی تدریس کے لئے استعمال ہونے والے آلات سے بھی اچھی طرح واقف ہونا چاہئے۔ اُردو زبان کے آغاز سے متعلق ماہرین لسانیات نے مختلف نظریات پیش کئے ہیں۔ ان میں سے چند اہم نظریات کو شامل نصاب کیا گیا ہے۔ اس سے زیرِ تربیت اردو اساتذہ کو اردو زبان کی نظریاتی ترقی کے بارے میں کافی حد تک معلومات حاصل ہو جائیں گی۔

خدا کی عطا کردہ بے شمار نعمتوں میں بصارت، سماعت اور کلام بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ زبان قدرت کی سب سے بڑی دین ہے انسان جو کچھ سوچتا اور محسوس کرتا ہے۔ اسے دوسروں پر بھی ظاہر کرنا چاہتا ہے۔ اس کے لئے وہ زبان کا استعمال کرتا ہے۔ انسان چونکہ ایک سماجی جانور ہے اپنی سماجی ضرورتوں کو پورا کرنے غرض سے اپنے جذبات اور خیالات کے اظہار کے لئے کبھی آوازوں سے اور کبھی اشاروں سے اپنی مافی الضمیر کا اظہار کیا ہوگا۔ یہی آوازیں اور اشارے زبان کے وجود کا باعث بنے۔ بقول پروفیسر انعام اللہ خان شروانی زبان صرف انسان کے خیالات کے اظہار کا اہم مرکزی ذریعہ ہی نہیں بلکہ ایک نسل دوسری نسل کی تہذیب کی ترسیل کے لئے بھی لازم اور ضروری ہے زبان انسان کے مختلف جذبات ومحسوسات کی ترجمان ہے۔

یونانی مفکرین نے جس طرح دوسرے علوم کے آغاز پر غور وخوص کیا۔ اسی طرح زبان کے آغاز کے مسئلے پر بھی نظریاتی انداز سے سوچا۔ انھوں نے مختلف نظریئے پیش کئے جو لسانیات کی تاریخ کا حصہ بن چکے ہیں۔ 1668ء میں ہابس (Hobbes) نے اپنی کتاب (Elements of Philosophy) میں زبان کے آغاز سے بحث کی ہے۔ اٹھارویں صدی میں جدید لسانیات کا مطالعہ شروع ہوا۔ تب سے فلسفیوں، حکیموں اور ماہرین لسانیات نے پھر اس مسئلے پر غور کیا اور طرح طرح کے نظریئے پیش کرنا شروع کئے۔

آغاز زبان کے نظریئے: زبان کے آغاز کے بارے میں مختلف نظریئے پیش کئے جاتے رہے ہیں۔ان میں سے کوئی بھی نظریہ سائنٹیفک نہیں ہے۔محض قیاس آرائیوں سے کام لیا جاتا ہے۔ایک خیال یہ ہے کہ دنیا کی ساری زبانیں کسی ایک زبان سے پیدا ہوئیں اس کو ایک خلقی نظریہ کہتے ہیں۔دوسرا خیال یہ ہے کہ زبانوں کی ابتداء دنیا کے مختلف خطوں میں آزادانہ طور پر ہوئی اس کو کثیر خلقی نظریہ کہتے ہیں۔سوال یہ ہے کہ زبان یا زبانیں بنیں کیسے؟ اس بارے میں جو نظریئے پیش کئے گئے ان میں سے چند اہم نظریوں کا خلاصہ ذیل میں پیش کیا جاتا ہے۔

الہامی نظریہ Theory of Religion: زبان کے آغاز کے بارے میں ایک نظریہ مذاہب کا ہے جو زبانوں کو الہامی قرار دیتے ہیں۔ ہر مذہب کے ماننے والے اس زبان کو الہامی زبان کہتے ہیں۔جس میں ان کی مذہبی کتابیں مرقوم ہوئیں عیسائی ، عبرانی کو مسلمان عربی کو آسمانی زبان سمجھتے ہیں ہندوؤں میں سنسکرت کو دیومانی ، یا دیو بھاشا کہا جاتا ہے۔بودھون کا عقیدہ ہے کہ پالی دنیا کی قدیم زبان ہے جو ازل سے چلی آرہی ہے۔اس نظریئے پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ اگر زبان کی تخلیق الوہی ہوتی تو وہ بہت منظّم اور باقاعدہ ہوتی لیکن ایسا نہیں ہے ہر زبان میں بے اصولی اور بے ترتیبی پائی جاتی ہے۔

فطری نظریہ Natural Theory: یہ نظریہ فیثا غورث (Phthororus) Herokritos اور افلاطون کا ہے افلاطون نے اپنے مجموعہ مکالمات میں لفظوں کے آغاز پر بحث کی ہے اور اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ شئے اور اس کے نام میں کوئی فطری اور لازمی تعلق ہوتا ہے۔یہ کہنا کہ اشیا اور ان کے ناموں میں کوئی پراسرار فطری تعلق ہوتا ہے۔ایسی بے تکی بات ہے جس کی تردید کی ضرورت نہیں۔اس نظریئے کے حامیوں کے پیش نظر محض یونانی زبان تھی۔انہیں معلوم نہ تھا کہ ہر شئے کے لئے مختلف زبانوں میں میں مختلف نام ہوتے ہیں۔

معاہدے کا نظریہ (Theory of Contract): یہ نظریہ زبان کو انسانوں کے باہمی معاہدے کا نتیجہ قرار دیتا ہے ۔ یعنی انسانوں نے اشیاء کے مختلف ناموں کو بالاتفاق طے کیا۔ پانچویں صدی قبل مسیح میں ڈیموکریٹس (Democritus) اور چوتھی صدی قبل مسیح میں ارسطو نے زبان کو باہمی قول وقرار کا نتیجہ قرار دیا اس کو روسو (Roussau) نے 1754ء میں واضح کیا۔اس نے ریاست کی طرح زبان کو بھی سماجی معاہدے کا نتیجہ قرار دیا۔

صوت تقلیدی نظریہ (Bow-Vow Theory) جانور جو آوازیں نکالتے ہیں۔عام طور پر بچّے انہی آوازوں سے جانوروں کو موسوم کر دیتے ہیں۔مثلاً میاؤں میاؤں، بھوں بھوں، میں میں، انھیں آوازوں سے چند الفاظ بھی گھڑ لئے گئے ہیں جیسے بھونکنا، ہنہنانا وغیرہ۔اسی نظریے کی رو سے ہر زبان کے صرف چند لفظوں کی اصل معلوم ہو جاتی ہے لیکن باقی ہزاروں الفاظ کی توجیہہ نہیں ہو سکتی۔

اشیاء کی جھنکار کی نقل کا نظریہ (Onomotopocie Theory): اس نظریئے کے مطابق مظاہر قدرت اور مختلف اشیاء میں گونج اور جھنکار کی آوازوں کو الفاظ میں ڈھالا گیا۔ جیسے گڑگڑاہٹ، گڑبڑ، گرج، ٹن ٹن، کھٹ کھٹ وغیرہ۔اس قسم کے الفاظ زبان میں کم ہی ملتے ہیں۔اس لئے یہ نظریہ قبول نہیں کیا جا سکتا۔

مادّوں کا نظریہ (Ding, Dong or Root Theory): اس نظریئے کے موجد پروفیسر ہیزے (Prof. Heyse) ہیں ان کے شاگرد ڈاکٹر اسٹائن تھال نے اسے تحریری شکل میں شائع کیا۔ان کا خیال ہے کہ آواز اور معنی میں ایک پراسرار رشتہ ہوتا ہے۔کسی شئے پر ضرب لگائی جائے تو اس سے خاص قسم کی جھنکار پیدا ہوتی ہے۔اسے سن کر انسان کے منہ سے ویسی ہی کوئی آواز نکل جاتی تھی۔مثلاً دھات پر چوٹ پڑنے پر ٹن کی آواز اور لکڑی پر ضرب پڑنے سے کھٹ کی آواز منھ سے ادا ہوئی ہوگی۔ایسی ہی آوازوں سے ابتدائی زبان کے مادّے بنے ہوں گے۔ابتدا میں ایسی آوازیں بہت زیادہ تھیں۔زبان کی نشو ونما کے ساتھ ان میں کمی ہوتی گئی۔

فجائی نظریہ (Pooh - Pooh Theory): میکس ملر نے اس نظریئے کو 'پوہ پوہ' نظریہ کہا ہے کسی جذبے کی شدت میں منھ سے کوئی اضطراری آواز نکل جاتی ہے۔جیسے اُف، ہائے، واہ، یا انگریزی میں پوہ پوہ یہی آوازیں زبان کا بیج ہوتی ہیں۔اس نظریئے پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے۔ایسی فجائی آوازیں ہر زبان میں بہت کم ہوتی ہیں۔اس کے علاوہ ان کلمات سے مزید لفظ نہیں بنائے جا سکتے اس لئے ان آوازوں سے کوئی زبان پیدا نہیں ہو سکتی۔

ہائی ہو نظریہ (Yo-heho Theory): یہ اجتماعی محنت کا نظریہ ہے۔جب مزدور کوئی بھاری بوجھ اُٹھاتے ہیں یا کسی کام میں سخت جسمانی قوت سے کام لیتے ہیں۔تو سب مل کر کچھ آوازیں بلند کرتے ہیں جس سے کام کا بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے۔جیسے 'ہائی سوٗ۔مغربی ملکوں میں جہازوں کے لنگر کھینچتے وقت ملاح ''یو، ہے، ہو'' کا نعرہ لگاتے ہیں

سمجھا جاتا ہے کہ انھیں آوازوں سے بعض لفظ بنے جیسے یو، ہے، ہو سے انگریزی لفظ Heave بنا ہے۔ اس نظریئے کو نوار Noire نے پیش کیا۔ یہ نظریہ اس لئے قابل اعتبار ہے کہ کسی بھی زبان میں ایسے لفظوں کی تعداد زیادہ نہیں ہے۔

ہنری سیوٹ کا نظریہ (Henry Sioecets Theory): ہنری سیوٹ انیسویں صدی کے ماہر لسانیات تھے اُنھوں نے کئی نظریوں کی مدد سے اپنا نظریہ قائم کیا۔ ان کے مطابق ابتداء میں زبان اشاروں (Gestures) اور اصوات پر مشتمل تھی۔ ابتدائی الفاظ تین قسم کے تھے۔ (۱) نقل اصوات (۲) فجائی الفاظ (۳) رمزی الفاظ

(۱) نقل اصوات : حیوانات کی آوازوں کی نقل ہے جیسے سنسکرت کاک (کوّا) انگریزی کوکو (کوئل) قدیم مصری کاؤ (بلی)۔ (۲) فجائی الفاظ: جو شدتِ جذبات کی پیداوار تھے مثلاً ہائے، اُف وغیرہ۔ (۳) رمزی الفاظ: یہ وہ الفاظ ہیں جن کے محض اتفاق یا کسی اور تعلق کی بنا پر کوئی مخصوص معنی فرض کر لئے جاتے ہیں۔ مثلاً بچہ دودھ پینے میں ہونٹوں کا استعمال کرتا ہے۔ اسی سے ہونٹوں کی جنبش کی مشق ہو جاتی ہے۔ ہونٹوں کی جنبش سے دولبی آوازیں جیسے ب، پ، م پیدا ہوتی ہے اس نے شروع میں پاپا، بابا، ماما جیسے الفاظ ادا کئے ماں باپ نے انھیں خود سے موسوم کر دیا۔ پنگوڑے کے یہ الفاظ (Nursery Words) مختلف زبانوں میں اس طرح کے رمزیاتی معنی میں لئے گئے ہیں۔ ملاحظہ ہو عبرانی اور عربی میں اَم، اَب یونانیمیں Peter, Mater لاطینی میں Pater,mater انگریزی میں ماما، پاپا، ہندی اردو میں ماں، بابا، ابّا وغیرہ۔

خلاصہ : زبان انسان کی صلاحیت نطق کا نام ہے۔ زبان انسان کا قیمتی سرمایہ ہے یہ کوئی جامہ چیز نہیں زبان کے بغیر انسانی شخصیت کی ترقی ممکن نہیں۔ زبان کے آغاز کے بارے میں مختلف نظریئے منظر عام پر آئے۔ ان میں سے کوئی نظریہ سائنٹفک نہیں محض قیاس آرائیوں سے کام لیا جاتا رہا ہے۔ زبانیں کیسے بنیں؟ اس بارے میں مختلف نظریے سامنے آتے جیسے الہامی نظریہ، فطری نظریہ، معاہدے کا نظریہ، صوت تقلیدی نظریہ، اشیاء کی جھنکار کی نقل کا نظریہ، مادّوں کا نظریہ، فجائی نظریہ اور ہنری سیوٹ کا نظریہ وغیرہ۔

IX - اُردو زبان کی ابتدا Origin of Urdu Language

تاریخ زبان کے متعلق مواد: ہندوستانی زبان کی ساخت اور آغاز وارتقاء کے متعلق جو مواد اس وقت تک موجود ہے اس کی چار قسمیں ہیں:۔

۱۔ قدیم تذکرے ۲۔ فرانسیسی اور انگریزی تصنیفات

۳۔ عہد متوسط کی تحریریں ۴۔ عہد حاضر کی تحقیقات

پہلی قسم کا مواد اردو شعر وشاعری کے ان تذکروں پر مشتمل ہے جو زیادہ تر فارسی زبان میں لکھے گئے ہیں۔ اور جن میں سوائے اردو شاعروں پر ایک سطحی نظر ڈالنے کے کوئی اہم تاریخی مواد نہیں پیش کیا گیا ہے۔ تاہم بعض تذکروں (مثلاً تذکرۂ میر حسن نکات الشعراء، منحرف نکات، تذکرۂ مصحفی، گلزارِ ابراہیم وغیرہ) کے دیباچہ میں یا اصل متن میں کہیں کہیں ایک دو جملے ایسے آ گئے ہیں۔ جو اردو زبان کے آغاز کی نسبت ان تذکرہ نویسوں کا نقطۂ خیال ظاہر کرتے ہیں۔ انہیں تذکروں کے سلسلے میں انشاء اللہ خان کی کتاب، ''دریائے لطافت'' کا ذکر بھی ضروری ہے۔ جو موضوع زیر بحث پر کچھ روشنی ضرور ڈالتی ہے۔

دوسری قسم کے مواد میں سب سے پہلے گارسان دتاسی کے کارنامے پیش نظر ہوتے ہیں۔ یہ پہلا شخص ہے جس نے ایک مکمل تاریخ ادبیات ہندوستانی لکھی۔ اس کے علاوہ اس نے ہماری زبان کے متعلق فرانسیسی میں تقریباً تین کتابیں شائع کیں۔ اس فرانسیسی محسن کے علاوہ ہمیں متعدد انگریز پرستارانِ اُردو کے نام بھی ملتے ہیں۔ جنہوں نے کسی طرح ہمارے اس موضوع کے متعلق مواد محفوظ کر دیا۔ گلکرائسٹ، فاربس افیکن، اسپرنگر اور اسٹوارٹ کے نام تاریخ اردو میں شاید ہی بھلائے جا سکیں گے۔

تیسری قسم کا مواد عہد متوسط کی تحریروں مثلاً میر امّن، کا ''باغ و بہار''، ''محمد حسین آزاد کا مقدمہ'' ''آبِ حیات'' سرسید اور ان کے ہم خیالوں کی بعض عبارتوں اور شرّر کے چند مضامین پر مشتمل ہے۔ چوتھی قسم کا مواد عہد حاضر کی تحقیقات ہیں۔ جو انگریزی اور اردو دونوں زبانوں میں پیش کی گئی ہیں۔ انگریزی تحریروں میں گریرسن کا لنگوسٹک سروے آف انڈیا (ہندوستانی زبانوں کا جائزہ) سب سے پہلے قابل ذکر ہے۔ اس کے بعد پروفیسر ٹرنر، ڈاکٹر بیلی اور پروفیسر جولس بلوک کی تحقیقات ہیں۔ جنہوں نے گذشتہ قائم کئے ہوئے متعدد خیالات میں کافی تبدیلی پیدا کر دی۔ اسی سلسلہ

میں پروفیسر سنیتی کمار چٹرجی اور ڈاکٹر عبدالطیف کا نام لینا ضروری ہے۔جنہوں نے اردو زبان کے متعلق بھی غور وخوص کیا اور مفید نتیجے پیش کئے ہیں۔آخر میں رام بابو سکسینہ کی ''تاریخ ادب اردو'' کا ذکر بھی ضروری ہے۔

تاریخ اردو زبان متعلق عہد حاضر کی جن اردو کتابوں سے مواد حاصل ہوتا ہے۔ ان میں (۱) اردوئے قدیم''(حکیم شمس اللہ قادری) (۲) دکن میں اردو (نصیر الدین ہاشمی) (۳) پنجاب میں اُردو (پروفیسر حافظ محمود شیرانی) (۴) اردو شہ پارے شمس اللہ قادری (۵) مقدمۂ تاریخ زبان اردو (پروفیسر مسعود حسین خان) وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ان تمام تحریروں کے مطالعہ کے بعد تحقیقات کرنے والا عجیب کش مکش میں پڑ جاتا ہے۔ کیونکہ اس کو قسم قسم کے خیالات اور بیانات سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔اتنا ضرور ہے کہ ان سب میں اردو زبان کے آغاز کو ہندو مسلم میل جول کا نتیجہ قرار دیا گیا ہے۔مگر اس میل جول کے مقام،نوعیت اور پھر نتیجے نکالنے میں ماہرین لسانیات ایک دوسرے سے مختلف ہیں اور اس طرح زبان کے آغاز کے متعلق جدا جدا نظریئے پیش کرتے ہیں۔

مختلف نظریے : زبان کی تاریخ اور ادب کی تاریخ میں بہت فرق ہے، زبان پہلے وجود میں آتی ہے ادب بعد میں ظہور میں آتا ہے۔تاریخ ادب میں ادب کے آغاز اور اس کے ارتقاء کا مطالعہ ہوتا ہے۔تاریخ زبان میں زبان کی ابتداء اور اس کے ارتقاء سے بحث کی جاتی ہے۔تاریخ زبان میں سب سے پہلے یہ دیکھنا ہوتا ہے کہ اس زبان کا تعلق زبانوں کے کس خاندان سے ہے۔جس طرح انسانوں کی ان کی خصوصیات کی بناء پر مختلف نسلوں میں بانٹا جاتا ہے۔(جیسے آریا، دراوڑ، نیگرو، منگول وغیرہ) اسی طرح زبانوں کو بھی تقسیم کیا جاتا ہے۔

اردو زبان کا تعلق ''ہند آریائی خاندان'' (Indo-Aryan Family of Languages) سے ہے۔ہندوستان میں زبانوں کے دو اہم خاندان ملتے ہیں۔ایک ہند آریائی، دوسرا دراوڑی

ہندوستانی زبانیں

ہند آریائی　　دراوڑی

اردو ہندی مراٹھی پنجابی وغیرہ　　تمل تلگو ملیالم کنڑا وغیرہ

اردو زبان کی ابتداء اور آغاز کے متعلق مختلف نظریات ملتے ہیں لیکن ان میں ایک بات مشترک ہے کہ تمام محققین نے یہ تسلیم کیا ہے کہ اردو زبان کا آغاز ہندو مسلمانوں کے میل جول کا نتیجہ ہے۔

پہلا نظریہ : ایک نظریہ یہ ہے کہ اردو جسے ہندوستانی کہا گیا اس کا آغاز دکن میں ہوا۔ ساتویں صدی عیسوی کے وسط میں عرب مسلمان تاجر سمندر پار کر کے ہندوستان پہنچے اور ساحل ملابار پر آئے ۔ بعض حضرات کا خیال ہے کہ اسی ہندو مسلمان میل جول کی وجہ سے ایک زبان بن گئی جو موجودہ اردو کی ماں تھی۔ اس نظریے کو سید سلیمان ندوی نے اپنی تصنیف ''نقوش سلیمانی'' میں پیش کیا۔ ان کا کہنا ہے کہ عربوں کے تجارتی تعلقات ساحل ملابار اور مدراس کے علاقوں سے رہے۔ نصیرالدین ہاشمی نے بھی اپنی کتاب ''دکن میں اردو'' میں اسی نظریے سے ملتا جلتا نظریہ پیش کیا ہے۔ یہ نظریہ اس لئے قابل قبول نہیں ہے کہ اردو ایک آریائی زبان ہے۔ عرب تاجر جہاں آئے وہاں کی زبان دراوڑی تھی ایسی صورت میں اردو پر عربی کا اثر زیادہ ہوتا جبکہ فارسی کا اثر زیادہ نظر آتا ہے۔

دوسرا نظریہ : اس کے بعد مسلمان سندھ کو آئے۔ یہ آٹھویں صدی عیسوی کی بات ہے۔ اس وقت ان کا مقصد تجارت نہیں اپنی مقبوضات کو وسیع کرنا تھا۔ محمد بن قاسم نے یہاں حکومت قائم کی۔ کہا جاتا ہے کہ مسلمان چار سو سال تک یہاں حکومت کرتے رہے۔ بعض حضرات نے یہ خیال پیش کیا کہ سندھ میں مسلمانوں کے قیام کی وجہ سے ایک ایسی زبان بنی جو اردو کی ابتدائی شکل تھی۔ اس خیال کو بھی مذکورہ بالا اسباب کی بناء پر مسترد کیا جا سکتا ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو اردو پر عربی کا اثر زیادہ گہرا ہوتا جبکہ حقیقت یہ ہے کہ اردو پر فارسی کا اثر زیادہ ہے۔

تیسرا نظریہ: سندھ کے بعد مسلمانوں کی حکومت محمود غزنوی کے حملوں کے بعد پنجاب میں قائم ہوئی۔ بعض ماہر لسانیات اس بات پر زور دیتے ہیں۔ کہ اردو کا آغاز پنجاب ہی میں ہوا اور اردو پنجابی سے نکلی ہے حافظ محمود شیرانی نے اپنی کتاب ''پنجاب میں اردو'' میں اس نظریہ کو پیش کیا۔ انھوں نے اپنے دعوے کی دلیل میں پنجابی اور دکنی کی مماثلتوں کو پیش کیا ہے۔ مگر بقول احتشام حسین ''یہ بات کچھ کچھ صحیح ہے کہ شروع میں ہم کو اردو میں پنجابی کا اثر ملتا ہے۔ مگر صحیح بات یہ ہے کہ جس طرح پنجابی زبان بن رہی تھی اسی طرح (اس وقت) دلی کے پاس کی بولیوں میں مل کر اردو بھی بن رہی تھی۔''

چوتھا اور پانچواں نظریہ: بعض ماہرین نے اردو کا رشتہ دراوڑی زبان سے جوڑنا چاہا ہے اس نظریے کے سہیل بخاری نے پیش کیا اور کچھ لوگوں نے اس کا رشتہ پالی زبان سے بھی جوڑا ہے۔ اس نظریے کی حامی شوکت سبزواری ہیں۔ لیکن اکثر ماہرین لسانیات نے ان نظریات کو لسانی بنیادوں پر تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔

چھٹا نظریہ : جس نظریے پر اکثر ماہرین لسانیات متفق ہیں اس نظریے کو مسعود حسین خان نے اپنی کتاب ''مقدمہ تاریخ

زبان اردو'' میں پیش کیا ہے۔انھوں نے مختلف دلیلوں سے یہ ثابت کیا ہے کہ اردو نہ سندھ میں پیدا ہوئی اور نہ جنوبی ہند میں اور نہ ہی یہ پنجابی سے نکلی اور نہ ہی پالی سے۔مسعود حسین خان کا نظریہ یہ ہے کہ اردو کہ تہہ میں جو بنیادی بولی ہے۔اس کا تعلق پنجاب یا دیگر علاقوں سے نہیں بلکہ نواحِ دہلی سے ہے۔ان کا کہنا ہے کہ اردو کی داغ بیل مسلمانوں کے دہلی آنے کے بعد ہی پڑی۔جب مسلمان دہلی آئے۔(محمد غوری نے تیرہویں صدی میں دہلی کی سلطنت کو فتح کیا اور اس کے بعد یہاں مسلمانوں کی حکومتوں کا سلسلہ شروع ہوا) تو اس وقت وہاں کھڑی بولی اور ہریانی بولی جاتی تھی۔دلی اور اس کے پورب (مشرق) میں جو بولی، بولی جاتی تھی۔اس کو کھڑی بولی کہا جاتا ہے۔دلی کی دوسری طرف ہریانی بھی رائج تھی۔مسلمانوں کی آمد کی وجہ سے دلی اور اس کے آس پاس بولی جانے والی کھڑی بولی میں فارسی، عربی اور ترکی لفظ شامل ہو گئے۔(کھڑی بولی ہند آریائی زبان کی ایک شاخ ہے جس کا سلسلہ شورسینی پراکرت اور اپ بھرش سے ملتا ہے) اس طرح ایک نئی زبان وجود میں آئی جو آگے چل کر اردو کہلائی۔

ساتواں نظریہ : محی الدین قادری زورؔ نے اپنی کتاب ''ہندوستانی لسانیات'' لکھ کر مسعود حسین خان کے نظریے کو تقویت پہنچائی ہے، ان کے نظریے کے مطابق دہلی میں مسلمانوں کی آمد کی وجہ سے کھڑی بولی میں جو تبدیلی پیدا ہوئی۔اس سے وہ زبان بنی جس کو عام طور سے ''ہندوستانی'' کہا جاتا ہے۔جس کی دو ادبی شکلیں ہیں۔(۱) اردو (۲) ہندی۔اردو کو مختلف ناموں سے پکارا گیا مثلاً زبان ہند، ہندی، ہندوی، زبان دہلی، دہلوی اور ریختہ وغیرہ۔اردو زبان کے آغاز کو آسانی سے ذیل کے جدول کے ذریعہ سمجھا جا سکتا ہے۔

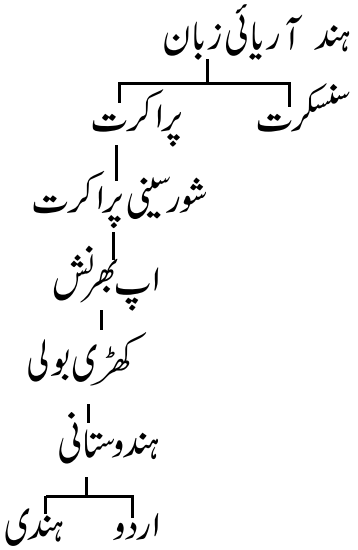

X - مادری زبان کی اہمیت

Importance of Mother Tongue

''مادری زبان'' وہ زبان ہے جسے ہر انسان دنیا میں آنکھ کھولنے پر اپنے ماں باپ اور گردونواح سے سیکھتا اور عہدِ طفولت سے اسے بولتا ہوا عہدِ بلوغت میں داخل ہوتا ہے۔ باقی زبانیں جنھیں وہ اسکول میں یا دوسروں سے سیکھتا ہے ''ثانوی'' زبانیں کہلاتی ہیں۔ زبان محض خیالات کے اظہار یا افہام وتفہیم کا مصنوعی آلہ نہیں بلکہ بنیادی طور سے متعلقہ گروہ کے طرزِ حیات کی مظہر ہے۔ دوسرے لفظوں میں زبان ہر لسانی گروہ کی تہذیب وثقافت کا جزو لازم ہے۔ زبانوں کی آموزش بھی کوئی میکانیکی عمل نہیں بلکہ ایک کلچرل یعنی تہذیبی عمل ہے۔ یعنی بڑی حد تک افراد بذات خود اسے اخذ کرتے ہیں اور کسی حد تک دوسروں سے اس کی تعلیم پاتے ہیں۔ مثلاً اسکول میں داخل ہونے سے پہلے ہر بچہ اپنی بات کو کہنے، دوسروں کی بات کا جواب دینے، موزوں اور ناموزوں الفاظ کے مابین فرق کرنے کے قابل اور بنیادی الفاظ وتراکیب سے واقف ہو جاتا ہے۔ یہی زبان اسکولی سطح پر زبان کی تدریس کی بنیاد بنتی ہے۔ یعنی لازم ہے کہ پہلی زبان یا ثانوی زبان کو سیکھنے سے قبل ہر متعلّم اپنی مادری زبان کے بنیادی الفاظ، تراکیب، ساختوں اور صوتیات سے واقف ہو۔ مادری زبان کی تعلیم اور مادری زبان کے وسیلے سے تعلیم اس لئے ضروری ہے کہ زبان اور کلچر باہم لازم وملزم ہیں۔ اگر ایک طرف ہر زبان اپنے مخصوص کلچر کی پیداوار ہے تو دوسری طرف اس کلچر کی ترسیل زبان کے وسیلے کی محتاج ہے۔

درحقیقت کوئی بھی زبان کسی دوسری زبان سے افضل نہیں ہوتی ہے۔ محض فرق یہ ہے کہ مادری زبان کا وسیلہ اپنایئے گا تو آپ کا مخصوص کلچر اور رسم خط باقی رہے گا۔ دوسرا وسیلہ اپنایئے گا تو آپ کا کلچر اور رسم الخط معدوم ہوگا اور اس طرح آپ کا تشخص ختم ہو جائے گا اور آپ دوسرے تہذیبی گروہوں میں ضم ہو جائیں گے۔

انسانی سماج میں مادری زبان کی بہت اہمیت ہے فرد واحد سماج کا ایک حصہ ہوتا ہے۔ فرد کے لئے مادری زبان ناگزیر ہے جب یہی فرد سماج میں ملتا ہے تو سماج سے ہاتھ ملا کر چلنے کے لئے بھی مادری زبان کی ضرورت پڑتی ہے۔ اس لئے ماہرین تعلیم بڑے بڑے مفکر ومبلغ، فلاسفر اور تعلیمی نفسیات کے ماہرین نے بھی مادری زبان میں تعلیم دینے کی اہمیت پر نہ صرف زور دیا ہے بلکہ اسے مستحکم بنیاد بھی مانا ہے۔